PDF Compressor Free Version

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

نائب صدور

جناب سلطان اختر

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

مدیر

مشتاق احمد نوری

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

Mob. 09431080070

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۳۷ شمارہ : ۵

مئی ۲۰۱۶ء

زرتعاون : دس روپے

سالانہ : سو روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

''زبان و ادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

email : zabanoadabbua@gmail.com

buapat2014@gmail.com

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.org

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

PDF Compressor Free Version

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	مشتاق احمد نوری	۳
مقالات	اردو کی عصری صورت حال	غضنفر	۵
	بانو سرتاج کے افسانوں کا میزان	نورالحسنین	۹
	عالم خورشید کی نئی غزلیں	عشرت ظفر	۱۴
	فیضؔ کی مزاحمتی نفسیات: ایک جائزہ	ڈاکٹر فصیح الدین احمد	۱۷
	سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری کے چند نقوش	متھن کمار	۲۳
افسانے	لذت	ایم۔ مبین	۲۸
	سروجنی	محمد ہاشم خان	۳۲
	پانچواں موسم	ہما فلک	۳۷
انشائیہ	قصہ ایک راجہ کے وزیر ہو جانے کا	پروفیسر اعجاز علی ارشد	۴۰
منظومات	حمد پاک / نعت شریف	قوسؔ صدیقی	۴۴
	سات جنموں کی الجھی کتھا نظم ہے	سلیم شہزاد	۴۵
	یوں امتحان لیا خاکداں بنا کے مجھے	احمد نثارؔ	۴۷
	پھر تیری یاد دبے پاؤں چلی آئی ہے	فردوسؔ گیاوی	۴۸
	رباعیات	ظفرؔ کمالی	۴۹
	رباعیات	ڈاکٹر قمرؔ رئیس بہرائچی	۵۰
	رباعیات	محسن باعشن حسرتؔ / مامون ایمنؔ	۵۱
	رباعیات	سمیع احمد صدیقی / ڈاکٹر اعجازؔ مانپوری	۵۲
	رباعیات	اصغرؔ ویلوری / اشرفؔ یعقوبی	۵۳
وفیات	قطعات تاریخ وفات	پروفیسر عبدالمنان طرزی	۵۴
کتابوں کی دنیا	چاندنی خیالوں کی — صدر عالم گوہرؔ	مبصر : ڈاکٹر حسن رضا	۵۵
	کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے — احمد صغیر	مبصر : ڈاکٹر نزہت پروین	۵۶
	حدوں سے آگے — ڈاکٹر محمد مستر	مبصر : ڈاکٹر قیصر زاہدی	۵۹
	علاقائی زبانوں کی کہانیاں — ڈاکٹر بانو سرتاج	مبصر : ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ	۶۰
ہماری سرگرمیاں	بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام کل ہند اردو صحافتی سمینار، تقسیم ایوارڈ اور مشاعرہ		۶۲
	اکادمی کے ذریعہ بزرگ شاعر معصوم شرفی امیرؔ کی پزیرائی اور معاونت		۶۷
سلام و پیام	نورالہدیٰ، شمس جلیلی، اختر حسین آفتاب، پروفیسر محمد انوار الحق قسمؔ، شرف الہدیٰ، شکیل سہسرامی، اسماء پروین، محمد گلزار عالم، روشن آرا، خورشید عالم، محبّ الرحمٰن وفاؔ، شاہ نواز انصاری، اسماعیل پرواز، خالد خاں ہادی (علیگ)		۶۸

بچوں کا زبان وادب

PDF Compressor Free Version

اداریہ

حرف آغاز

اردو زبان وادب کی صورت حال پر اکثر و بیشتر گفتگو ہوتی رہتی ہے اور اس سلسلے کی ساری کمیوں کی گاج آخر میں سرکار یا سرکاری ادارے پر گرادی جاتی ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ چلو ہم آج اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گئے۔

ایسی گفتگو سن کر مجھے وہ شتر مرغ یاد آتا ہے جو طوفان کی آمد پر اپنے چھوٹے سے منھ کو ریت میں چھپا کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ اب طوفان سے محفوظ ہے۔ اردو کی زبوں حالی یا خوش حالی پر گفتگو ضرور کرنی چاہئے، لیکن ہمیں یہ بھی احتساب کرتے رہنا چاہئے کہ ہم نے ذاتی طور پر اس سلسلے میں اب تک کیا کچھ کیا ہے اور کر رہے ہیں؟

ہندوستان کے سارے صوبوں میں بہار ہی وہ صوبہ ہے جہاں اردو اپنی پوری توانائی کے ساتھ زندہ ہے، البتہ کشمیر میں اس کی صورت کچھ اور بہتر ہے کہ وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد، یہاں سے زیادہ ہے۔

اردو کی بنیادی تعلیم ایک بڑا مسئلہ ضرور ہے، لیکن یہ مسئلہ اتنا بڑا بھی نہیں ہے کہ ہم اس کے حل کی صورت نہ تلاش کر سکیں۔ دراصل بنیادی تعلیم کا مسئلہ ہر شخص کی اپنی ذات سے جڑا ہوا ہے، کیونکہ ہر بچے کی تعلیم کی ابتدا اس کے گھر سے ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کو اردو اور عربی کی تعلیم گھر پر دلوائیں تو ہمارے بچوں کی دلچسپی اردو سے بنی رہے گی اور آگے چل کر وہ اس زبان سے محبت محسوس کریں گے۔

متوسط طبقہ کے لوگوں کے بچے سرکاری اسکول اور مدارس میں تعلیم پاتے ہیں، جہاں اردو کی پڑھائی کا نظم ہوتا ہے، جب کہ سجے سجائے ڈرائنگ روم میں اردو زبان کی نشو ونما پر زوردار بحث کرنے والوں کے بچے، عموماً انہیں پرائیوٹ اسکولوں میں پڑھنے جاتے ہیں جہاں اردو پڑھانے کا رواج نہیں ہے اور مزید یہ کہ ان کے گارجین کو اس کی ذرا بھی فکر نہیں ہوتی کہ ان کے بچے، قرآن اور اردو سے نابلد ہیں، لیکن ہم ہیں کہ ساری توانائی انہیں کے بچوں کی ناعاقبت اندیشی پر بحث کر کے ختم کر دیتے ہیں ہونا تو یہ چاہئے کہ ہم پہلا چراغ یہ سوچ کر اپنے گھر میں جلائیں کہ اس چراغ سے ہزاروں چراغ جل سکتے ہیں، لیکن ایسا نہ کر کے ہم اردو کی سیاست کرتے ہیں اور سارا الزام سرکار پر تھوپ دیتے ہیں اور جو بچتا ہے اس کا ٹھیکرا اردو اداروں کے سر پھوڑ دیتے ہیں، جب کہ سچائی یہ ہے کہ سرکار نے ہر کام کے لئے الگ الگ شعبے بنائے ہیں اور اردو کے تعلق سے مختلف کام، مختلف شعبوں سے کرائے جاتے ہیں، لیکن تعجب تب ہوتا ہے، جب سب کی نگاہیں اردو اکادمیوں پر ٹک جاتی ہیں کہ یہ کام بھی اسے ہی کرنا چاہئے حالاں کہ سچائی یہ ہے کہ ہر اکادمی کے اپنے ضابطے ہیں، اس کے دائرے میں رہ کر اسے عمل کرنا ہوتا ہے مثلاً دہلی اردو اکادمی جو کام کرتی ہے، ضروری نہیں کہ وہی کام بہار اردو اکادمی بھی کرے، اسی طرح بہار اردو اکادمی کی جو سرگرمیاں ہیں اس کی توقع ہم دہلی اردو اکادمی سے کرنے لگیں تو یہ کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہوگا۔ اردو کا ہر شیدائی یہ چاہتا ہے کہ اردو سے تعلق رکھنے والے سارے کام اردو اکادمی ہی کو کرنا چاہئے۔ ایسا سوچنا اکادمیوں کے حق میں نہیں جاتا، کیونکہ اردو اکادمیاں اپنے ضابطے کی حد سے باہر نہیں جا سکتیں۔

اگر اردو کا ہر شیدائی اردو کی نشو ونما کی ذمہ داری اپنے اپنے گھر سے ہی پوری کرنی شروع کر دے تو اردو کا کوئی مسئلہ ہی باقی نہیں رہے گا۔ دراصل یہ مسئلے اردو زبان کے نہ ہو کر، اردو والوں کے مسئلے ہو کر رہ گئے ہیں۔ جس دن ہم اپنی ذمہ داری سمجھ کر مسائل کو حل کرنا شروع کریں گے، اس دن اجتماعی طور پر بھی ہم یقیناً کامیاب ہوں گے۔

PDF Compressor Free Version

اردو زبان مر رہی ہے یا اس کے قاری ختم ہو رہے ہیں۔ یہ آواز میں پچھلی چار دہائیوں سے سن رہا ہوں، لیکن آج بھی سچائی یہ ہے کہ بہار اردو کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ فکشن ہو، شاعری ہو یا تنقید و تحقیق، ہر معاملے میں، ہر زمانے میں بہار نے اپنا سر بلند رکھا ہے۔ ہندوستان سے نکلنے والے جتنے اہم رسائل ہیں۔ ان کی سب سے زیادہ کھپت بہار میں ہوتی ہے اور بہار کے ادیب و شاعر اور صحافی ملک کے جس خطے میں بھی ہوں، ان کا شمار اردو کے سربرآوردہ قلم کاروں میں ہوتا ہے۔

ہم اپنے منفی رویے سے کسی بھی مسئلے کا حل نہیں نکال سکتے۔ آدھے بھرے ہوئے گلاس کو، آدھا خالی کہنے کی ضد سے ہمیں پرہیز کرنا ہوگا، تب ہی ہم کامیابی کی دہلیز پار کر سکیں گے۔

یہ سال ادبا و شعرا کے لئے بہت بہتر نہیں رہا، گزشتہ سال کے آخر سے اب تک، ہند و پاک کے ایک سے بڑھ کر ایک مضبوط ستون گرتے چلے گئے۔ ہم نے جہاں انتظار حسین، جوگیندر پال جیسا فکشن نگار کھویا، وہیں ندا فاضلی، زبیر رضوی اور ملک زادہ منظور احمد جیسے شاعروں سے بھی ہم محروم ہو گئے اور انور سدید اور اسلوب احمد انصاری جیسے ناقد بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ یہ وہ فن کار تھے جو اپنے آپ میں ایک کائنات کا درجہ رکھتے تھے۔ فی الوقت ہم انہیں رسمی خراج عقیدت پیش کرنے کے سوا ان کے لئے کچھ اور کر بھی نہیں سکتے۔ البتہ آئندہ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم جستہ جستہ ان کی شخصیت اور فن کے نئے گوشے دریافت کرتے رہیں اور غالباً یہی ان کے لئے سچا خراج عقیدت بھی ہوگا۔

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ''زبان وادب'' کا ہر شمارہ اپنی مثال آپ بنے اور یہ رسالہ پورے ملک کے قلم کاروں کی نمائندگی کرنے والا رسالہ ہو، بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ہماری نظر عالمی ادب پہ بھی ہوتی ہے اور ہم اس کے نمونے بھی پیش کرتے رہتے ہیں، اس کے لئے ہمیں بہر حال باذوق اور بلند نظر قارئین کے ساتھ اچھے قلم کاروں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے ساتھ ہی ہم نئے قلم کاروں کی پزیرائی کرنا بھی اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں قارئین کے مشورے بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہوتے ہیں، کیونکہ ان ساری توانائیوں کو ایک ساتھ جوڑ کر ہی ہم ادب کا کوئی روشن مینار تعمیر کر سکتے ہیں۔

ہمیں آپ کے مشوروں کا انتظار رہے گا۔

✪ ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ شکیل الرحمٰن بھی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے، اس خبر نے مجھے اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔ ابھی حال ہی میں ۲۷، اپریل کو میں ان سے ملنے گڑگاؤں گیا تھا، جہاں اکادمی کے سب سے بڑے ''سید سلیمان ندوی ایوارڈ'' کی مومنٹو اور سند میں نے انہیں پیش کی تھی۔ وہ بہت خوش بھی ہوئے، لیکن ان کی حالت اس وقت بھی بہت اچھی نہیں تھی، وہ بہت کمزور دکھ رہے تھے اور جب میں واپس ہونے لگا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے مجھ سے کہا ''نوری صاحب آپ مجھے بھولئے گا نہیں'' یہ سن کر میں بھی آبدیدہ ہو گیا اور انہیں جواب دیا کہ ''سر آپ کو بھولنے کا مطلب ہے خود کو بھلا دینا، آپ کو اردو دنیا کبھی بھول نہیں پائے گی'' میں بہت دکھی من سے واپس آیا اور مجھے یہ احساس ہو گیا کہ یہ ان سے میری آخری ملاقات ہے۔

شکیل الرحمٰن ایک جمالیاتی لیجنڈ کا نام تھا۔ انہوں نے اردو ادب میں جس طرح جمالیات کی دریافت کی، یہ انہیں کا حصہ تھا۔ انہوں نے درجنوں کتابیں تخلیق کیں اور اردو تنقید پر ایک ایسی چھاپ چھوڑی جسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ ہم ادارے کی طرف سے ان کی روح کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

PDF Compressor Free Version

غضنفر

T.T.I Building, Maulana Mohammad Ali Johar Marg,
Jamia Millia Islamia, New Delhi 110025

اردو کی عصری صورت حال

جس زبان میں عدالت عظمیٰ کے فیصلے سنائے جاتے تھے، مفتیانِ دین کے فتوے صادر ہوتے تھے، فرماں رواؤں کے فرمان جاری ہوتے تھے، عمائدین مملکت آداب بجایا کرتے تھے، فریادی فریاد سنایا کرتے تھے، رؤسا و امرا جسے اپنے اظہار کا وسیلہ بناتے تھے اور شعرا و ادبا جس پر فخر کیا کرتے تھے اور جو تہذیبی، تہذیبی، مذہبی، معاشرتی اور تنظیمی مسئلوں کو آسانی سے حل کر دیا کرتی تھی، وہ زبان آج خود مسائل کے گھیرے میں گھری پڑی ہے۔ اس کے راستے کا سب سے بڑا روڑا، وہ احساس ہے جسے وقت نے اس کے اپنوں کے دل و دماغ میں ڈال دیا ہے جو رگوں میں سانپ کی طرح سرسراتا ہے اور عصاب کو بچھو کی مانند ڈنک مارتا ہے۔ وہ ایسا احساس ہے جو مختلف صورتوں میں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ مختلف انداز سے دباؤ ڈالتا ہے اور مختلف حربوں سے قدم قدم پر اس زبان کو ضرر پہنچاتا ہے اور ایسی ایسی تاویلیں پیش کرتا ہے کہ اپنی زبان پر جان نچھاور کرنے والے، اب اس کے پاس جانے سے بھی کتراتے ہیں، اپنے لبوں پر سجا کر اترانے والے اب اسے اپنے ہونٹوں تک لانے سے گھبراتے ہیں، اس احساس نے آنکھوں کے آگے ایسے ایسے سائے لہرادئے ہیں کہ اپنی زبان کی جانب بڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اور آگے بڑھے تو وہ سائے ڈس لیں گے۔

یہ احساس اس احساس سے بھی توی تر ہے کہ اردو پڑھنے سے معاش کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا، حالاں کہ زبانیں اس لئے نہیں سیکھی جاتیں کہ ان سے محض روزی روٹی کے مسئلے کو حل کرنا ہے۔ زبانیں تو اس لئے بھی حاصل کی جاتی ہیں کہ وہ ہمیں گونگا ہونے سے بچاتی ہیں۔ ہماری آواز کو پرواز دیتی ہیں، دلوں کے دروازے کھولتی ہیں، دماغوں کی کھڑکیاں روشن کرتی ہیں، ہمارے وجود کو انسانی اور بامعنی بناتی ہیں اور ہم کو اس راز کا پتا دیتی ہیں کہ کیسے دلوں کی دوریاں مٹائی جاتی ہیں؟ کس طرح قربتیں بڑھائی جاتی ہیں؟ کیسے کسی کو دل میں بسایا جاتا ہے اور کس طرح کسی کے اندرون میں سمایا جاتا ہے، مگر پتا نہیں کیسے اردو والوں کے اندر یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے سے شخصیت کی پیشانی پر پسماندگی کا لیبل لگ جاتا ہے اور اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی کہ اردو شرفا کی زبان رہی ہے، اس کو اپنانے والا مہذب سمجھا جاتا رہا ہے اور اس کا جاننے والا اس بات پر فخر محسوس کرتا رہا ہے کہ اسے بھی وہ زبان آتی ہے جو لبوں پر آتی ہے تو منھ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں، ساعتوں میں سنگیت بج اٹھتے ہیں، سانسوں میں خوشبو گھل جاتی ہے اور رگ و ریشے میں تازگی بھر جاتی ہے اور جس کا سننے والا تماشائی اور بولنے والا مرکز نگاہ بن جاتا ہے، مگر صد افسوس کہ جو زبان لبوں پر سجی رہتی تھی آج سینے میں بھنچی ہوئی ہے، کسی شکنجے میں کسی ہوئی ہے اور یہ سب اس احساس کا فساد ہے جو کسی چڑیل کی طرح دل و دماغ پر اپنا سایہ ڈال چکا ہے۔

یہ احساس مختلف انداز سے اردو والوں کو اردو کے قریب جانے سے روکتا ہے۔ مثلاً اس کے دباؤ کے زیر اثر اردو والے:

(۱) اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکول میں نہیں بھیجتے یا مجبوری میں بھیجتے ہیں۔

(۲) اپنے بچوں کو اردو مکتب میں بھیجنے کے بجائے انگریزی میڈیم کے پبلک اسکول میں بھیجنا پسند کرتے ہیں، چاہے ان کا معیار خراب اور پست ہی کیوں نہ ہو۔

(۳) محفلوں اور مجلسوں میں اردو میں اظہارِ خیال کے بجائے انگریزی میں بولنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں یا انگریزی کمزور ہونے پر خاموش رہ جانا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو بہتر خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں اور اپنے افکار کے اظہار پر قادر ہیں، وہ انگریزی کے

PDF Compressor Free Version

غلبے اور رعب کی بدولت اپنے خیالات کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور نتیجتاً بہتر خیالات کے بجائے کمزور اور کمتر خیالات معاشرے میں راہ پاجاتے ہیں۔

(۴) اردو کی کتابیں اور اردو کے جرائد و رسائل نہیں خریدتے اور حتی المقدور کوشش کرتے ہیں کہ ان کے ڈرائنگ اور اسٹڈی روم میں اردو کی کتابیں نظر نہ آئیں۔

(۵) شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے دعوت نامے اردو کے بجائے انگریزی یا ہندی میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۶) اردو ادارے بھی سرکاری کام کاج اردو کی بجائے انگریزی یا ہندی میں کرتے ہیں جب کہ ایسا کرنے میں کوئی قانونی دباؤ بھی نہیں ہوتا۔ وہ آسانی سے بلاخوف وخطر یہ کام اردو میں کرسکتے ہیں۔

(۷) بعض سیاست داں جو بہت اچھی اردو جانتے ہیں، وہ بھی اپنی تقریروں میں قصداً ہندی اور انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں جب کہ غیر اردو داں اپنی گفتگو کو اردو کے لفظوں کے استعمال سے زیادہ بہتر اور مؤثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۸) ان تعلیمی اداروں میں بھی جہاں اردو کا رواج رہا ہے اور جہاں اردو میں درس وتدریس اور دفتری خط وکتابت کی اجازت ہے، اردو کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بہت آسانی سے جہاں اردو میں بات کی جاسکتی ہے اور دعوت نامے اور اشتہار اردو میں چھاپے جاسکتے ہیں، وہاں اردو کی جگہ انگریزی یا ہندی کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔

(۹) ٹرینوں، ہوائی جہازوں، بسوں وغیرہ کے سفر میں اردو والے اردو بولنے اور اردو کے رسائل واخبارات اور کتابیں کھولنے سے گریز کرتے ہیں۔

(۱۰) بعض یونیورسٹیوں کے چوتھے درجے کے ملازمین جو کہ زیادہ تر اردو میں تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور انہیں اچھی اردو آتی ہے، اپنے جلسوں اور دیگر سرگرمیوں میں اردو کی بجائے ہندی اور انگریزی زبانوں کے استعمال پر زیادہ زور دیتے ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اردو کو سرے سے ایسے موقعوں پر خارج کردیتے ہیں۔ یہ نظارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے درجہ چار کے ملازموں کی تنظیمی اور احتجاجی سرگرمیوں کے موقعے پر بٹنے والے پمفلٹ اور دیواروں پر چسپاں پوسٹروں میں نمایاں انداز میں دکھائی دیتا ہے، جہاں ساری کی ساری تحریریں بائیں جانب سے لکھی ہوتی ہیں۔

(۱۱) بعض ریسرچ اسکالرز تو یہ بتاتے ہوئے بھی عار محسوس کرتے ہیں کہ وہ اردو کے اسکالرز ہیں۔

(۱۲) وہ یونیورسٹی جس کے بنیاد گزاروں میں اردو والے یعنی سرسید احمد خاں، مولوی سمیع اللہ، مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا شبلی نعمانی وغیرہ تھے اور جہاں سرسید احمد اور سر راس مسعود سے لے کر شعبۂ فارسی کے پروفیسر نذیر، شعبۂ ہندی کے پروفیسر رویندر بھرمر، شعبۂ تاریخ کے پروفیسر عرفان حبیب، شعبۂ فزکس کے پروفیسر سعید الظفر چغتائی، شعبۂ لسانیات کے پروفیسر مسعود حسن خان، شعبۂ انگریزی کے پروفیسر مسعود الحسن، میڈیکل کالج کے شعبۂ سرجری کے پروفیسر نسیم انصاری اور طبیہ کالج کے پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن تک سبھی اردو کے شیدائی تھے، آج اسی یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اردو کے خلاف پمفلٹ بٹواتا ہے اور مسلمانوں کو اردو سے دور رہنے کا مشورہ دیتا ہے اور اس کے اس مشورے پر کچھ لوگ محسوس اور کچھ لوگ غیر محسوس طریقے سے عمل پیرا بھی نظر آتے ہیں۔

مذکورہ بالا صورت احوال جس احساس کے نتیجے میں نظر آتی ہے اسے احساس کمتری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ احساس پیدا کیوں کر ہوا؟ کیوں کر یہ دل ودماغ میں گھر کر گیا؟ کیسے یہ فضا میں تحلیل ہوگیا؟ ان سوالوں پر غور کرتے وقت درج ذیل نکتوں پر نظر ٹھہرتی ہے:

(۱) انگریزی زبان کا رعب اور انگریزیت کا غلبہ

(۲) سیاسی صورتِ حال

(۳) تنظیمی صورتِ حال

(۴) تعلیمی صورتِ حال

انگریزی زبان کا رعب اور انگریزیت کا غلبہ

انگریزی کے رعب نے ہندوستانیوں کو اپنی زبان کی قدر و قیمت سے نا آشنا بلکہ متنفر کردیا ہے۔ انگریزی زبان کے آگے ان کی اپنی

PDF Compressor Free Version

زبان کمتر، بے وزن، بے مصرف، پیچ اور بے کار محسوس ہونے لگی ہے۔ انگریزی کا رعب ایسا بڑھا ہوا ہے کہ خراب انگریزی بول کر بھی بڑے سے بڑا کام نکال لیا جاتا ہے۔ اچھا خاصا بڑا اور پڑھا لکھا آدمی بھی کم پڑھے لکھے، مگر انگریزی داں کے سامنے اپنے کو احساس کمتری میں مبتلا پاتا ہے اور اپنے گھٹنے ٹیکتا ہوا نظر آتا ہے۔

انگریز ہندوستان سے چلے گئے، مگر ان کی زبان آج بھی ہمارے ملک پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اس زبان کا گھر، بازار، دفتر، سفر ہر جگہ غلبہ دیکھنے کو ملتا ہے اور یہ غلبہ اتنا زور آور ہے کہ دوسری زبانیں اس کے سامنے دب کر اپنی آواز کھو دیتی ہیں یا یوں کہئے کہ ان کی آوازیں اس کے دباؤ سے گھٹ کر دم توڑ دیتی ہیں۔ انگریزیت کا یہ غلبہ سب سے زیادہ اردو کو نقصان پہنچا رہا ہے اس لئے کہ ہندی کو تو سرکاری پشت پناہی حاصل ہو جاتی ہے اور اسے انگریزیت کے دباؤ سے بچا لینے کی شعوری کوشش اسے آزادانہ سانس لینے کی مہلت بخش دیتی ہے، لیکن بیچاری اردو کی پشت پناہی کون کرے۔ خود اردو والے بلکہ اس کی کمائی کھانے والے بھی اس کے بچاؤ کے لئے آگے نہیں آپاتے۔

سیاسی صورتِ حال

ملک کی سیاسی صورتِ حال ایسی ہے کہ اردو کی سرپرستی نہیں ہو پاتی۔ جس صورتِ حال سے ہمارا آج کا معاشرہ گزر رہا ہے اس میں اردو کو ایک خاص طبقہ سے جوڑ کر نہ صرف یہ کہ اردو کے دائرے کو تنگ کیا جا رہا ہے بلکہ اردو دشمنی کی فضا بھی تیار کی جا رہی ہے۔ وہ لوگ جنہیں اردو اچھی لگتی ہے اور اردو سے پیار کرتے ہیں، وہ بھی جب اپنے کانوں میں یہ آواز سنتے ہیں کہ اردو ان کی نہیں بلکہ ایک خاص فرقہ کی زبان ہے تو وہ بھی آہستہ آہستہ اردو کو غیر سمجھ کر اس سے شعوری اور غیر شعوری طور پر دور ہونے لگتے ہیں۔ دوسری طرف اردو والے جب سیاست میں داخل ہوتے ہیں اور جلسوں میں پبلک مقامات پر تقریریں شروع کرتے ہیں تو سیاسی مصلحت کے تحت قصداً اردو سے گریز کرتے ہیں۔ یہی سیاسی لوگ جب آگے چل کر زبانوں کے تحفظ و ترقی کے منصوبے بناتے ہیں اور اس کو عمل میں لانے کے قانون نافذ کرتے ہیں تو اپنی خود غرضی، مصلحت کوشی کے سبب اور حکومت وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے مقصد کے پیش نظر اردو کو قربان گاہ پر چڑھا دیتے ہیں۔

تنظیمی صورتِ حال

کسی زبان کی ترقی کا انحصار اس سے متعلق پالیسی اور اس پالیسی کو عملی صورت دینے والے تنظیمی ڈھانچے پر ہوتا ہے۔ اگر پالیسی صاف ستھری، واضح اور بنا کسی پیچ کے بنی ہے اور اس کے عمل میں گومگو کی پیچیدگیاں نہیں ہیں تو آگے بڑھنے یا بڑھانے میں دشواری پیش نہیں آتی اور اگر آتی بھی ہے تو تنظیمی بصیرتیں اور دور بینیاں، راہ کی رکاوٹیں ہٹا دیتی ہیں، لیکن اگر تنظیمی بصیرتیں ہی ترچھی یا جانب دار ہوں تو بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کوئی منزل تک پہنچ جائے یا کسی کو اس کی منزل مل جائے۔ اردو کے سلسلے میں دونوں ہی پیچ سے پُر ہیں ان کے بنانے والے اور انہیں لاگو کرنے والے دونوں ہی سیاست کے اسیر ہیں اور سیاست اردو کے تئیں مصلحت کوشی کی شکار ہے۔

تعلیمی صورتِ حال

ملک میں ایسی تعلیمی صورتِ حال ہے کہ حکومت کی پالیسی، اردو کے لئے سرکلر اور قانونی طور پر اس کی فلاح و بہبود کی گنجائش اور انتظام و انصرام کے باوجود اردو کی ترقی رکی ہوئی ہے بلکہ روز بہ روز اس کی تنزلی ہوتی جا رہی ہے۔ غیر محسوس طریقے سے ایسی حکمت عملی اپنائی جاتی ہے کہ اردو کو دل سے چاہنے والے اور اس کی تعلیم حاصل کرنے والے بھی کچھ دنوں کے بعد مجبور ہو کر اردو سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ اردو کی تعلیمی صورتِ حال کا عالم یہ ہے کہ:

- ☆ زیادہ تر اردو اساتذہ اردو نہیں پڑھاتے۔
- ☆ پرنسپل اردو کی کلاسس پر توجہ نہیں دیتے۔
- ☆ انتظامیہ اردو کے تئیں بے اعتنائی برتتی ہے اور تغافل شعاری سے کام لیتی ہے۔
- ☆ ماں باپ اور گارجین بھی اپنے بچوں کی اردو تعلیم پر بہت کم دھیان دیتے ہیں۔
- ☆ طلبہ بھی اردو پڑھنے میں دلچسپی کم لیتے ہیں۔
- ☆ اردو میڈیم اسکولوں میں اردو کے ذریعہ پڑھانے والے دوسرے سبجیکٹ کے اساتذہ بہت کم ہیں اور بعض اسکولوں میں تو ہیں بھی نہیں۔

PDF Compressor Free Version

☆ اردو میڈیم کی کتابیں اسکولوں میں بہت دیر سے پہنچتی ہیں جس کے سبب طلبہ کو تیاری کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امتحان کے نتائج اچھے نہیں ہو پاتے۔

☆ کتابیں نہ پہنچنے کی وجہ سے زیادہ تر طلبہ کو مجبوراً اپنا میڈیم تبدیل کرنا پڑتا ہے۔

☆ کوئی ایسی تنظیم بھی نہیں ہے جو ان شکایتوں پر توجہ دے اور ان کو دور کرنے کے سلسلے میں ٹھوس اقدامات کرے۔

☆ تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے نصابات بھی بے توجہی کے شکار ہیں۔ زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں کے نصابات وہی ہیں جو بہت پہلے بنائے گئے تھے جن میں نہ تو معیار کا خیال رکھا گیا ہے نہ ہی دلچسپی کا۔ بیش تر اسباق مشکل، فرسودہ اور غیر دلچسپ ہیں۔ ان میں درجہ بندی (گریڈیشن) کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ترتیب میں بھی کوئی منطق نظر نہیں آتی۔ ان میں نصاب بنانے والوں کی قابلیت کا مظاہرہ زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے اور نصاب کے تقاضوں اور لسانی مہارتوں کے مطالبوں پر توجہ کم دکھائی دیتی ہے۔

مذکورہ بالا جائزے کی روشنی میں یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ اردو زبان کی صورتِ حال اس ملک میں اچھی نہیں ہے بلکہ بعض اعتبار سے صورتِ حال اتنی خراب ہے کہ خوش فہمیوں کے چلمن سے باہر آ کر اگر مناسب اور مؤثر اقدامات نہ کیے گئے تو اسے خرابہ بننے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

اس خطرناک صورتِ حال اور تشویش ناک مستقبل سے نکلنے کی صورت یہ ہے کہ بہی خواہانِ اردو تبلیغی جماعت کے نظام دعوت کے جوش و خروش اور عیسائی مشنریوں کے مشنری اسپرٹ کے انداز پر اس زبان کے تحفظ اور فروغ کے لئے کام کریں اور ایسی تڑپ اور چاہت پیدا کریں جو معشوق کی فرقت میں عاشق کی ہوتی ہے اور اس تگ و دو کا مظاہرہ کریں جو حصولِ محبوب یا وصالِ یار کی خاطر صحراؤں میں نظر آتا ہے۔

اس سلسلے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ درج ذیل امور پر توجہ دی جائے:

(۱) اردو کے تئیں جو احساس دلوں میں گھر کر گیا کہ اردو پڑھنے والا پسماندہ ہے، اسے دور کیا جائے۔

(۲) اس احساس کو بھی دل و دماغ سے مٹایا جائے کہ اردو روزگار کے مواقع فراہم نہیں کرتی۔

(۳) روزگار کے سارے امکانات پر روشنی ڈالی جائے اور جہاں جہاں جس جس صورت میں روزگار کی گنجائشیں موجود ہیں، ان کی نشاندہی کی جائے۔

(۴) اردو تعلیم و تدریس پر زیادہ زور دیا جائے اور اسے سائنٹفک بنایا جائے۔

(۵) جہاں اردو تعلیم کا انتظام ہے وہاں اسے بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔

(۶) جہاں انتظام نہیں ہے، مگر پروویژن ہے وہاں انتظام کی صورت پیدا کی جائے۔

(۷) جہاں نہ انتظام ہے اور نہ ہی پروویژن، مگر پڑھنے والے مناسب تعداد میں موجود ہیں وہاں اردو کی تدریس کے انتظام کے لئے کوشش کی جائے۔

(۸) تدریسی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں دور کیا جائے۔

(۹) جو کمیاں ہیں وہ پوری کی جائیں۔

(۱۰) پرائمری سطح سے لے کر کالج اور یونیورسٹی کی سطح کے نصابات کو نصاب کے اصولوں اور جدید تدریسی تقاضوں کو سامنے رکھ کر ان پر نظرِ ثانی کی جائے۔ انہیں معیاری، مؤثر، مفید، بہتر، نتیجہ خیز، دلچسپ اور آسان بنایا جائے۔

(۱۱) اردو بولنے، اردو سننے، اردو پڑھنے اور اردو لکھنے کی طرف لوگوں کو مائل کیا جائے۔ ان سے کہا جائے کے ٹنڈے کباب والے کے ہاں ایک بار کباب ضرور کھائیں اور ہاتھ دھوتے وقت واش بیسن کے پاس چسپاں اس سلوگن کو ضرور پڑھیں "اردو بولئے، اردو پڑھئے اور اردو لکھئے"۔

(۱۲) گھروں میں اردو کا ماحول قائم کیا جائے۔

(۱۳) بچوں میں اردو کی اہمیت کو اجاگر کر کے اردو سے ان کی رغبت پیدا کی جائے۔

(۱۴) اچھی، معیاری، خوبصورت، معلوماتی اور دلچسپ کتابیں شائع کی جائیں۔

(۱۵) اردو کی اچھی فلمیں اور سیریل دکھانے کا اہتمام کیا جائے۔

(۱۶) مرکزی حکومت کے زیر اہتمام چلائے جانے والے مراکز

(بقیہ ص ۳۹ پر)

PDF Compressor Free Version

نورالحسنین

1-12-31, Ghati , Aurangabad 431001

بانو سرتاج کے افسانوں کا میزان

بانو سرتاج افسانہ نگاری کی طرف کب راغب ہوئیں، اس کا تو اندازہ نہیں ہے مجھے، لیکن اُن کا شمار بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں اپنی شناخت بنانے والوں میں ہوتا ہے۔ یہ بات میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ وہ بیک وقت اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں۔ افسانہ نگاری کے علاوہ اُنھوں نے ڈرامہ، بچوں کا ادب اور تنقید بھی لکھی، لیکن میں ایسا سمجھتا ہوں کہ افسانہ نگاری اُن کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ وہ حال میں جیتی ہیں اور اپنے اطراف بکھرے ہوئے ماحول سے موضوعات کشید کرتی ہیں اور زمین پر آباد انسانوں کو اپنے کرداروں میں ڈھالتی ہیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات، رشتوں کا تصادم اور تقدس، بدلتی قدریں، انسانی رویے، کہیں مفاد پرستی، کہیں فرض شناسی، کہیں ماں باپ بوجھ ہیں تو کہیں اسی تناظر میں خود کی پرکھ، کہیں دبی دبی جنسی خواہشیں، کہیں بے جوڑ شادی کا کرب، کہیں بیٹی کانچ کا برتن، اور کہیں مکمل آزادی، کہیں مرد کی انا اور جبلت کی شکار عورت، ان کے افسانوں کی یہی دنیا ہے۔ وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھتی ہیں اور دکھاتی بھی ہیں۔

زندگی کے ان ہزار رنگوں کے باوجود ان کے افسانوں کا مرکزی موضوع ''عورت'' ہے۔ عورت خواہ با اختیار ہو، بے اختیار ہو، تعلیم یافتہ ہو، یا ان پڑھ ہو، دولت مند ہو یا غربت کی ماری۔ انہوں نے اُسے کبھی مرد کا کھلونا پایا، کبھی زمانے کے ہاتھوں اُس کا استحصال دیکھا اور کبھی خود عورت کو عورت کا استحصال کرتے ہوئے پایا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بانو نے ایسی عورتوں پر کڑی تنقید کی ہے جو اپنی شکل وصورت پر بھروسہ کرنے کے بجائے نہایت بے ڈھنگے میک اپ کا سہارا لے کر اپنی جہالت کا ثبوت دیتی ہیں۔ خصوصاً متوسط طبقے کی عورتیں اس مرض میں زیادہ مبتلا ہیں۔ وہ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے افسانہ ''گہرے سمندر کا سفر'' میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''اسے متوسط طبقے کی عورتوں کی دو عادتوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اوّل تو یہ کہ یہ عورتیں فیشن کا مطلب سمجھتی ہیں، نہ موقع اور مناسبت کو مدنظر رکھتی ہیں۔ شوخ وشنگ کپڑے پہن کر سرخی پاوڈر تھوپ لینا اُن کے تئیں فیشن پرست کہلانے کے لیے کافی ہے۔ فیشن کے مطابق اونچا بلاؤز پہن لیں گی، مگر یہ دیکھ لینے کی احتیاط نہیں برتیں گی کہ بریسیر کے ہک برابر لگے ہیں یا نہیں۔''

افسانہ ''گہرے سمندر کا سفر'' ایک ایسی تعلیم یافتہ مخلص عورت مہیما کی کہانی ہے، جس نے والدین کی پسند کو اولیت دی اور شادی کی اور بے انتہا محبت کا دعویٰ کرنے والا شوہر، شرد ماتھر ایک دن یہ کہہ کر الگ ہو گیا کہ اُسے اولاد چاہیے اور مہیما کی قسمت میں اولاد نہ تھی، پھر ایک اتفاقی حادثے میں اُس کی دوستی سشیل شرما سے ہوئی جو جز معاش ہے۔ بیوی بچوں والا ہے۔ یہ حادثہ دوستی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور مہیما کھلے دل سے اُس کی مدد کرتی ہے۔ اپنی سفارش کے ذریعے اُس کا پرموشن کرواتی ہے، لیکن سنیل شرما بھی صرف موقع کا فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ اپنی بیوی سے متعلق شکایتیں کر کے اُس سے ہمدردی حاصل کر رہا ہے۔ اُس کے دل سے کھیل رہا ہے۔

ایک دن مہیما، سشیل کی بیوی انجلی سے ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے ملتی ہے اور اُس کی زندگی کو ٹٹولنے کی کوشش کرتی ہے تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ اُس کے منہ پر اُس سے ہمدردی کے ناٹک کرنے والا سشیل شرما دراصل کیا ہے:

> ''انجلی پھر ہنسی..... میرے پتی نے مجھے تمام باتیں

PDF Compressor Free Version

تفصیل سے بتا کر کہا تھا..... انجو! لوگوں کے بہکاوے میں آ کر کبھی مجھے غلط نہ سمجھنا۔ مہیما ماتھر عورت نہیں دیوی ہے..... وہ رُک گئی، پھر اچانک ہنس کر بولی: 'سچی وہ عورت ہے بھی نہیں.....!' مہیما نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ بولی، ''چلئے بات ہی ختم ہوگئی۔ وہ..... آپ کے پتی کی زندگی میں آنے والی دوسری عورت نہیں ہے..... لیکن آپ نے ابھی یہ کیا کہا کہ وہ عورت ہے ہی نہیں؟..... اس کی وضاحت کریں گی آپ.....؟ میرے پتی کہتے ہیں عورت وہ ہے جو پتی کو اولاد دے، عورت وہ ہے جو پتی کے دکھ سکھ میں اُس کا ساتھ دے۔ مہیما میں یہ دونوں اوصاف نہیں ہیں۔''

ہماری سوسائٹی مردوں کی سوسائٹی ہے، جس میں عورت کا مقصد یا تو شوہر کی آسائش و تسکین ہے یا پھر بچے پیدا کرنے والی مشین اور جس عورت میں یہ کمی ہو وہ ہماری سوسائٹی میں وقعت نہیں پا سکتی۔ یہ عورت پر سراسر ظلم کے مترادف ہے، لیکن کتنے گھرانے ایسے ہیں جو ایسی عورتوں کے ساتھ انصاف کرتے ہیں، چنانچہ افسانہ ''گہرے سمندر کا سفر'' کی عورت جب افسانہ ''بھیک'' میں پہنچتی ہے تو اپنی تمام تر ظاہرداری، دولت، امارت، عزت و وقار کے باوجود محض اولاد نہ ہونے کے سبب ایک بھیک مانگنے والی، اُسے اپنے سے بھی حقیر سمجھتی ہے اور اُس پر طنز کے نشتر چلاتی ہے۔

افسانہ ''عورت'' بظاہر پست اقوام طبقے کی کہانی ہے، لیکن عورت کی مامتا ہر طبقے میں یکساں ہے۔ خدا جانے بدامی جیسی سیدھی سادھی عورتوں پر پنچانن جیسے مرد کیسے کیسے ظلم توڑتے ہیں اور وہ برابر برداشت کیے جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ظلم سے تنگ آ کر راہ فرار اختیار کر لیتی ہیں، لیکن مرد کی صرف معمولی سی پسپائی یا ندامت ایسی عورتوں کے سارے باغیانہ خیالات کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں اور ہزار ہا برائیوں کے باوجود انھیں اپنا شوہر فرشتوں سے بھی بہتر نظر آنے لگتا ہے۔ دوسری طرف بانو سرتاج نے اُس عورت کی بھی کہانی لکھی ہے جو اپنی دولت مندی کی آڑ میں اپنی بے راہ روی کی خاطر شوہر کو بطور منگل سوتر کے استعمال کرتی ہے۔ افسانہ 'بجوکا' ایک ایسی ہی دولت مند عورت کا افسانہ ہے، جسے شوہر صرف نام کے لیے چاہیے، اسی طرح جس طرح کھیتوں میں پرندوں کو دھوکا دینے کی خاطر بجوکا کھڑا کیا جاتا ہے۔ اسی عنوان سے سلام بن رزاق کا بھی ایک افسانہ ہے، لیکن اِس افسانے میں بجوکا اُس شوہر کی علامت ہے جو اپنی بیوی کی حفاظت کرتا ہے۔ بانو کے نزدیک میاں بیوی کی محبت ایک اٹوٹ سمبندھ ہے۔ وہ ان کے رشتوں کی صداقت اور وارفتگی کی معترف ہے۔ بانو سرتاج کا افسانہ ''اُس کے لیے'' ایک عمدہ افسانہ ہے جس میں میاں بیوی کے درمیان بے انتہا محبت کے باوجود ایک خلا بھی ہے، دوری بھی ہے، ایک مجبوری بھی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر اس خلا کو وہ صرف بیٹی کی شادی کی اطلاع تک ہی محدود رکھتیں، تب بھی افسانہ مکمل تھا، لیکن شادی کے موقع پر جذامی ماں کی آمد اور پھر اُس کا فقیروں میں کھڑے رہ کر اپنی بیٹی کو تکنا خالصتاً فلمی انداز ہو گیا ہے۔

دنیا کا ہر مذہب ماں باپ کی تعظیم اور اُن کی خدمت کو اولیت کا درجہ دیتا ہے، لیکن اس کے باوجود ماں باپ کی گود میں پروان چڑھنے والی نسل جب عملی زندگی میں قدم رکھتی ہے تو اکثر ماں باپ کے احسانوں کو بھول جاتی ہے اور اپنی اولاد کی خوشی میں یہ بات فراموش کر دیتی ہیں کہ کل آنے والا مستقبل بھی انھیں اُسی مقام پر چھوڑ آئے گا جہاں آج اُنھوں نے اپنے ماں باپ کو چھوڑا ہے۔ بانو نے اس احساس کی اُنگلی تھام کر، ''پھینکی ہوئی عورت''، ''چلو اب مر جائیں'' اور ''غلطی'' جیسے ذہن و دل کو جھنجھوڑنے والے افسانے اپنے قاری کو دیے ہیں۔

افسانہ ''پھینکی ہوئی عورت'' اُس ماں کی کہانی ہے جس کا بیٹا، بہو اور پوتا کلومنالی ایک مہینے کے لیے پکنک منانے اس احتیاط کے ساتھ جاتے ہیں کہ بیچاری ماں کو تمام تر عصری سہولتوں سے محروم کر دیتے ہیں، بیچاری ماں تنہا گھر میں وقت بتائے تو کیسے بتائے؟

''ردّی اخباروں کا بے ترتیب ڈھیر اُن کے سامنے تھا۔ وہ ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ ملازمہ کی چھٹی، فریج بند، ٹی وی چینل بند، پڑوسیوں سے میل جول پر پہرے کے بعد یہ اخبار کیوں کر رہ گئے؟ کیا اس لیے کہ ردّی ہیں خیر! کون سا انھیں زمانے کے ساتھ چلنا ہے جو تازہ اخبار

PDF Compressor Free Version

ہی پڑھے جائیں۔ اُنہوں نے آگے بڑھ کر چند اخبار اُٹھا لیے اور آہستہ آہستہ نیچے اُتر آئیں۔ پڑھنا ہی ہے تو پرانے اخبار بھی پڑھے جا سکتے ہیں..... کون کہتا ہے ردّی چیزیں کام میں نہیں آتیں ..... ان کے دل میں ٹیس اُٹھی۔ چار سال قبل اُن کے شوہر کے انتقال کے بعد بہو اُنہیں اپنے ساتھ لانے پر آمادہ نہیں تھی۔ بیٹے نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے..... 'میں اکیلی اولاد ہوں اُن کی، کہاں جائیں گی اماں؟ لوگ کیا کہیں گے؟ لے چلتے ہیں۔ پڑی رہیں گی ایک طرف.....' دو آنسو ہاتھ میں پکڑے اخبار پر لڑھک آئے۔ اُنھیں صاف کر کے اماں نے اخبار کو سہلایا اور بولیں..... ہماری تمہاری قسمت ایک ہی ہے بھیا، کام نکل گیا، پھینک دیئے گئے۔ آؤ ہم مل کر ایک دوسرے کا دُکھ بانٹیں آرام کرسی پر لیٹ کر اُنہوں نے اخبار کھول لیا۔''

دوسرا افسانہ ''چلو اب مر جائیں'' اولاد کے ہاتھوں ماں باپ کی بے بسی اور مجبوریوں کی ایک ایسی کہانی ہے جسے پڑھ کر دو نگلے کھڑے ہو جاتے ہیں اور فرض و حق یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا اسی دن کی خاطر ماں باپ اپنا لہو پلا کر اولاد کی پرورش کرتے ہیں؟ اس افسانے میں نرملا اور بلونت وہ بدقسمت ماں باپ ہیں جن کے دکھ درد کی بہو اور بیٹے کو فکر ہی نہیں ہے۔ باپ بیمار ہے اور ماں علاج کے لیے بیٹے سے پیسے مانگ رہی ہے۔ جواب میں اُسے گھرکیاں ملتی ہیں۔ یہ وہ ماں باپ ہیں جنھوں نے اپنی محنت سے کمائی ہوئی ایک ایک پائی جوڑ کر بیٹے کو ذاتی گھر دلایا ہے۔ اپنا سب کچھ اُن پر نچھاور کر دیا ہے، لیکن جواب میں اُنھیں کیا ملا:

''ناتھ بس کچھ دیر اور صبر کرو۔ میں ذرا حاجی نصیر احمد کے بنگلے تک چلی گئی تھی ..... بلونت نے آنکھوں سے سوال کیا..... کیوں گئی تھی.....؟ پھر تکلیف سے آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں..... معلوم ہوا، وہاں زکواۃ بٹ رہی ہے۔ میں بھی جا کر قطار میں لگ گئی۔ میرا نمبر آیا تو میں نے حجن اماں کے پاؤں پکڑ لیے۔ رو رو کر تمہارا حال بتایا تو ہزار روپے دیئے ہیں حجن اماں نے..... ہزار روپے..... حیرت سے بلونت کی آنکھیں کھل گئیں۔ 'ہاں!' نرملا نے اُٹھ کر دو گلاسوں میں پانی نکالا اور اُن میں کوئی سفوف حل کرنے لگی..... 'تو پھر دوائی لائی ہے تو؟' ..... نرملا نے اپنی دُھن میں کہا 'لو مٹے وقت مندر گئی، بھگوان کو پرساد چڑھایا۔ لو پہلے یہ پرساد کھا لو' اُس نے پیڑا بلونت کے منھ میں دے دیا اور گلاس آگے بڑھاتی ہوئی بولی 'اب آنکھ اور ناک بند کر کے اِسے پی جاؤ' دوسرا گلاس خود اپنے منھ سے لگا لیا نرملا نے۔ 'نرملا' بلونت نے پوچھا 'کیا تھا یہ بہت کڑوا تھا'..... 'زندگی کی حقیقتوں سے کم ہی کڑوا ہوگا ناتھ! اشوک نے میری سوگندھ کھائی تھی۔ کیٹ ناشک کے لیے بھی روپے چاہیے تھے اور کریا کرم کے لیے بھی، اس لیے میں زکواۃ مانگ لائی۔ بھگوان ہمارے بیٹے کو اچھا رکھے..... پلنگ پر بیٹھ کر نرملا نے اپنا سر بلونت کے قدموں میں رکھ دیا اور بولی: 'ناتھ چلو اب مر جائیں۔''

یہ ایک ایسا المیہ ہے جسے حقیقت کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے، لیکن اس سے انکار بھی ممکن نہیں، جانے ایسے کتنے واقعات ہیں جو آئے دن ہمارے مشاہدے کا حصہ بنتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہماری نظریں ایسی اولادوں پر بھی ٹھہرتی ہیں جنھوں نے اپنے والدین کو نعمت سمجھا اور اُن کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ بانو کا افسانہ ''غلطی'' ایسے ہی ایک نوجوان کشور کی کہانی ہے جو ماں باپ کی خدمت کے لیے بیوی کی طرف بھی نہیں دیکھتا۔ ماں گٹھیا کی مریضہ ہے تو باپ کو بلڈ پریشر۔ وہ اُنھیں زیادہ سے زیادہ وقت دیتا، خود اُن کے کمرے کو، اپنے ہاتھوں صاف کرتا۔ ماں باپ کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے بیوی بچوں کا بھی اُتنا ہی خیال رکھتا ہے۔ ایک دن وہ بیوی کا ایک جملہ سن لیتا ہے جو وہ اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی کہ کیا کروں؟ ساس سسر کے مارے پریشان ہوں۔ ساسو جی پلنگ سے اُٹھ نہیں سکتی۔ سسر جی سارا گھر گندہ کر دیتے ہیں۔ بار بار غسل خانہ

PDF Compressor Free Version

جاتے ہیں۔ بیل کی طرح پیشاب کرتے ہوئے چلتے ہیں۔

کشور کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے، اور ایک دن اچانک وہ اپنے ذاتی مکان کو چھوڑ کر ایک بڑے سے کرائے کے مکان میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے ہی ماں باپ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں واپس آتا ہے تو بیوی کو حیرت ہوتی ہے کہ مکان میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ تب کشور اُسے اپنی غلطی کے بابت بتاتا ہے:

''اسی لئے تو کرائے کے مکان میں شفٹ ہونا پڑا تھا۔ کشور نے اشارہ کرتے ہوئے کہا..... وہ بچوں کا کمرہ تھوڑا چھوٹا کر دیا ہے۔ مہمانوں کا کمرہ جوں کا توں ہے۔ ہمارے بیڈروم میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے .....اسے کھولیے یہ کس کا کمرہ ہے؟..... یہ ہمارا کمرہ ہے..... ہمارا بیڈروم تو وہ اُدھر ہے۔ ہم دو دو کمروں میں رہیں گے کیا؟..... جھرنا نے مسکرا کر کہا' بیس سال بعد جب جوہی بیاہ کر سسرال چلی جائے گی اور گورو کی دُلہن آجائے گی تب ہمیں اس کمرے کی ضرورت پڑے گی جھرنا' کشور نے سنجیدگی سے کہا' میں سمجھی نہیں'..... میں سمجھاتا ہوں۔ جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے۔ تم گٹھیا کے درد سے پریشان رات دن پلنگ پر پڑی ہوگی اور میں بیمار کمزور ہو کر جانوروں کی طرح پیشاب کرتا چلوں گا۔ تب ہمیں اس کمرے کی ضرورت پڑے گی .....جھرنا کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ کشور اُس کے چہرے پر اپنے جملے کا ردوبدل دیکھ رہا تھا۔''

بانو کے دیگر افسانوں میں ''کیل سے ٹنگا بچپن'' ایک عمدہ نفسیاتی افسانہ ہے۔ اسے ہم کرداری افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی موضوع وہ افراد ہیں جو نواب جاگیرداروں کے گھر پیدا ہوں یا غربتوں کی دہلیز میں، اُن سے اگر اُن کا بچپن چھین لیا جائے تو وہ کبھی بھی نارمل زندگی نہیں جی سکتے۔ اسی طرح اُن کی نوجوانی اگر خاندانی انا اور وقار کی شکار ہو جائے تو وہ تنہائی پسند اور بہت حد تک خودسر ہو جاتے ہیں۔

بانو کے اس افسانے کا کردار خان داور زماں ایسا ہی ایک کردار ہے، جسے بیگم سارا نہایت نفسیاتی انداز سے اس خول سے باہر نکالتی ہے اور زندگی سے پیار کرنے والا انسان بنا دیتی ہے۔

اسی طرح مردوں کی نفسیات اور جبلت پر بانو کا افسانہ ''دو کوڑی کی عورت'' بھی ہے۔ اس میں اُنہوں نے مختلف طبقات کے مردوں کا انتخاب کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آخر وہ عورت کے متعلق کس قسم کے جذبات رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ ڈاکٹر جو اسپتالوں میں اپنے ساتھ کام کرنے والی لیڈی ڈاکٹر کے عشق میں مبتلا ہو کر شادی کرتے ہیں، بعد میں خود ہی اپنی بیوی پر شک کرنے لگتے ہیں۔ اکثر دولت مند گھرانوں کے لڑکے کہیں بھی دل لگا کر ماں باپ سے بغاوت کر کے شادی کر لیتے ہیں اور پھر جیسے ہی جذبات کا نشہ اُترتا ہے اور ہوش آتا ہے تو بیوی کو زندگی بھر ذلیل کرتے رہتے ہیں۔ ناتھانی اس افسانے میں یہی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ معاشرے میں وہ غریب غربا بھی ہیں جو ان پڑھ ہیں تانگہ، رکشہ، یا مزدوری کرتے ہیں۔ ریاض ایک رکشہ ڈرائیور ہے اور بیوی سے غلط کام کروانے میں بھی کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔ ایک اُستاد (ٹیچر) ہیں جو بیوی کو کسی ملکہ حسن سے کم نہیں سمجھتے، ہمیشہ اُس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں، اُس کا بڑا خیال رکھتے ہیں یہاں تک کہ اُسے کھڑکی دروازے سے جھانکنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ بے حد مذہبی ہیں، ہر وقت یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ شوہر مجازی خدا ہے۔ ایک دن دروازے کی اوٹ میں کھڑے رہ کر بیوی کی باتیں سن لیتے ہیں جو مظلوم عورتوں سے کہہ رہی تھی:

''تم لوگ احتجاج کیوں نہیں کرتیں؟ آخر ظلم سہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..... دھڑ سے دروازہ کھلا۔ سریتا، کامنی اور امینہ گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ میں نے بھی لپک کر دور پڑا دوپٹہ کھینچ کر سر پر اوڑھ لیا۔ ماسٹر جی سامنے کھڑے تھے۔ 'دو کوڑی کی عورت'..... وہ برہم ہو کر چلائے .....مجازی خدا کے خلاف عورتوں کو بہکاتی ہے۔ میں تجھے طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔''

ہمارے معاشرے میں یہ باتیں ممکنات میں سے ہیں بھی اور نہیں بھی۔

PDF Compressor Free Version

کیا سارے ہی مرد اس قسم کی ذہنیت کے شکار ہیں؟ اور کیا ساری ہی عورتیں بڑی نیک، پارسا اور مظلوم ہیں؟ اس افسانے کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں ایسے بہت سارے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

افسانہ ''بدلی ہوئی لڑکی'' اگر ایک کمزور افسانہ ہے۔ اس قسم کے افسانے خواتین کے میگزین میں اکثر پڑھنے کو مل جاتے ہیں، تو افسانہ ''اپنی مٹی کی تلاش'' وطن سے محبت اور رشتوں کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ آج کل زندگی برق رفتار ہوگئی ہے۔ ہر شخص اپنی خواہشات تک پہنچنے کے لیے کسی ایسے شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتا ہے جہاں وہ وقت سے پہلے پہنچ سکے، لیکن اس چکر میں اکثر غلط قدم اُٹھ جاتے ہیں جس کے باعث سوائے پچھتاوے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ افسانہ ''شارٹ کٹ'' ایسے ہی لوگوں کی داستان ہے۔

مرد خواہ کتنی ہی غلطیاں کرلے، پھر بھی معاشرہ اُسے وہ سزا نہیں دیتا جو اُسے ملنی چاہیے، لیکن لڑکی کی ایک غلطی چاہے وہ محض افواہ ہی کیوں نہ ہو، معاشرہ اُسے برداشت نہیں کرتا۔ ڈاکٹر بانو سرتاج پیشہ درس وتدریس سے وابستہ رہی ہیں۔ اُن کے سامنے نہ جانے ایسی کتنی ہی لڑکیوں کے واقعات آئے ہوں گے۔ کتنے ہی واقعات کا مشاہدہ ہوگا۔ کتنے ہی معاملات کو اُنہوں نے سلجھایا ہوگا۔ افسانہ ''صلیب پر ٹنگی ہوئی عورت'' میں اُنہوں نے یہی بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر لڑکی کا جھوٹ موٹ بھی نام کسی لڑکے کے ساتھ منسوب ہوجائے تو وہ ایک ایسا داغ بن جاتا ہے جو ساری زندگی اُس کے لیے اذیت کا باعث بن جاتا ہے۔ کرافٹ کے لحاظ سے بھی بانو کا یہ ایک اچھا افسانہ ہے۔

بانو کا افسانہ ''بنگلے کی ڈیوٹی'' مرد کی جنسی جبلتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانہ ''نیا موڑ'' کے ذریعے بانو نے ہوٹلوں میں کام کرنے والے کم سن لڑکوں کا کس طرح استحصال کیا جاتا ہے اُس کا نقشہ نہایت بولڈ انداز میں پیش کیا ہے، تو افسانہ ''ننگی ٹانگوں والی عورت'' اُس شخص کی کہانی ہے جو ماڈرن سوسائٹی میں اپنے آپ کو زیادہ آزاد خیال بنانے کے چکر میں اپنی حدوں کو پار کر جاتا ہے، لیکن اس سفر کا حاصل کیا ہے؟ کتنے لوگ اس سفر میں کامیاب ہوتے ہیں۔

آج کا یہ دور اشتہاری دور ہے۔ ان اشتہارات میں عورتوں کا خوب استعمال ہو رہا ہے۔ خود عورت اپنی اہمیت، عزت اور وقار کو بھول گئی ہے۔ مردوں کے شانہ بشانہ کھڑے رہنے کی ہوس نے اُسے آج کہاں پہنچا دیا ہے۔ افسانہ ''دھندے والی عورت'' کے ذریعے سیاحتی ٹور کمپنیاں اپنے ٹور کو دلچسپ بنانے کی خاطر آج کیسے کیسے طریقے اختیار کر رہی ہیں، اُس کا اندازہ ہوتا ہے:

> ''میں اپنے آپ کو روک نہ سکا، خوامخواہ بول گیا۔ اوہ اچھا ..... وہاں منالی میں ایسا لگتا تھا..... میرا مطلب ہے ..... میں آپ کا مطلب سمجھ گیا..... ہرش دیپ نے میری بات کاٹ کر کہا..... میں خود بھی وہی سمجھ رہا تھا جو دوسرے سمجھ رہے تھے، مگر میں بری طرح ٹھگا گیا۔ وہ سب فریب تھا بھیکا سنگھ کا اسٹنٹ..... اسٹنٹ! بھلا کیسے؟ مجھے حیرت ہوئی..... ذرا سوچئے۔ کسی خاص ٹور میں ایک ایسی جوان خوبصورت لڑکی شامل رہے جو تنہا نوجوانوں کو کمپنی دے تو کیا ٹورسٹ اُسے ترجیح نہ دیں گے؟ بھیکا سنگھ کی چاندی ہوجاتی ہے۔ خود وہ کافی کچھ تحفے کی شکل میں حاصل کرلیتی ہے..... بھیکا سنگھ کے ہر ٹور میں ایسی ایک لڑکی شامل رہتی ہے۔''

بانو سرتاج کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر عورتوں کے مسائل سے متعلق ہی ہیں، وہ رفعت نواز کی طرح اکثر گھر کی چار دیواری ہی میں موضوع کو تلاش کرلیتی ہیں۔ اگرچہ یہ اچھی بات ہے، لیکن بانو جیسی ادیبہ کو اپنا کینوس مزید کشادہ کرنا چاہیے۔ آج سماجی، سیاسی اور معاشرتی طور پر جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں اُن کی طرف بھی دیکھنا چاہیے۔ مغربی ممالک سے صارفیت، ترقی کے نام پر جو اثر انداز ہو رہی ہے، اُسے بھی قلم کی زد میں لانا چاہئے۔ انٹرنیٹ اور کیبل کلچر کس طرح مشرقی اقدار کا خون کر رہا ہے اسے بھی اُن کے افسانوں کا حصہ بننا چاہیے اور اُن کے لیے یہ کوئی مشکل بات بھی نہیں ہے۔ وہ مسلسل لکھ رہی ہیں بلکہ نثر کے میدان میں اُنھوں نے بہت کچھ لکھا بھی ہے۔ اُن کا قلم ابھی رواں ہے اور اُن سے بہتر افسانوں کی امید کی جاسکتی ہے۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

عشرت ظفر

Beauty Watch Co. Lal Imli Crossing, Cycle Market, Kanpur 208001

عالم خورشید کی نئی غزلیں

عالم خورشید کا پانچواں شعری مجموعہ پیش نگاہ ہے مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ بیسویں صدی کی نویں دہائی میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''نئے موسم کی تلاش'' شائع ہوا تھا، جس میں شامل غزلوں سے ہماری ادبی دنیا میں کچھ کلبلاہٹ نظر آئی تھی، مگر خاطر خواہ نہیں۔ بعد میں ان کے تین شعری مجموعے ''زہر گل''، ''خیال آباد'' اور ''کارزیاں'' شائع ہوئے اور ۲۰۱۴ میں ''نہ یہ بستی ہماری، نہ وہ صحرا ہمارا'' یعنی ان کا پانچواں شعری مجموعہ طلوع ہوا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کی غزل پر وہ توجہ نہیں دی گئی جس کی وہ مستحق تھی۔ یوں تو مشاہیر ادب نے چند سطور لکھ دیں، جیسا کہ شعری مجموعوں یا دیگر کتابوں کی یافتگی پر رسماً کیا جاتا ہے، مگر تفصیل سے بہت کم لکھا گیا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ''شعر و حکمت'' حیدرآباد، مارچ ۲۰۰۸ء میں عالم خورشید پر ایک گوشہ شائع کیا گیا تھا جس میں میری بھی ایک تحریر تھی جو ''خیال آباد'' کی غزلوں سے متعلق تھی، اس کے علاوہ عبدالصمد، رحمٰن شاہی، شموئیل احمد، وہاب اشرفی، مظہر امام اور امتیاز احمد کے مضامین بھی تھے۔ عالم خورشید کا ایک مختصر خاکہ اور ان کی بارہ غزلیں بھی تھیں۔ ان کے فن پاروں سے متعلق اور کہاں کیا شائع ہوا ہے، مجھے کچھ خاص علم نہیں ہے، لیکن مجھے یہ احساس ضرور ہے کہ اب تک وہ سب کچھ نہیں ہوا جس کی ضرورت عالم خورشید کی غزل کو ہے۔

بہار علم و ادب کی سرزمین ہے جس نے یاس یگانہ چنگیزی جیسے صاحب طرز و اسلوب اور نکھے شاعر کو جنم دیا، وہ یگانہ جس نے اردو غزل کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا اور اہل لکھنؤ کو جنہیں اپنی زبان و بیان پر بے حد غرور تھا، ناکوں چنے چبوائے۔ بہار ہی میں شاد عظیم آبادی، امداد امام اثر اور جمیل مظہری جیسی نابغہ روزگار شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کے نام اور کام کی تابانی کو صدیوں کی گرد بھی مندمل نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ اور بھی مشاہیر قلم کاروں کی طویل فہرست ہے جس میں حسن نعیم، پرکاش فکری، سلطان اختر، پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر لطف الرحمٰن جیسے اہم لوگ ہیں۔ میں شاعری کے حوالے سے بات کر رہا ہوں، ورنہ فکشن اور تنقید کے میدان میں بھی بہار کا ماضی سے لے کر اب تک بلند مقام ہے۔ عالم خورشید بھی اسی خاک کے زائیدہ و پروردہ ہیں۔ وہ ۱۹۵۹ء میں آرہ (بھوجپور) میں پیدا ہوئے تھے۔

نئی غزل تقریباً اپنے پچاس سال پورے کر چکی ہے ہراول دستہ کے کئی سپاہی باقی، زیب غوری، مصور سبزواری، پرکاش فکری، آزاد گلاٹی، کمار پاشی، امین اشرف، شہریار، عرفان صدیقی، اسعد بدایونی، (عرفان صدیقی اور اسعد بدایونی اگرچہ نئی غزل کے ہراول دستہ کے نہیں تھے، مگر بے حد اہم شاعر تھے)، مظہر امام، حسن نعیم، بساط بخن سے رخصت ہو چکے ہیں، مگر جو ہیں ان میں محمد علوی، مظفر حنفی، سلطان اختر، غلام مرتضیٰ راہی، مدحت الاختر اور زبیر رضوی خاص ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو جدید شاعری کے اولین انتخاب ''نئے نام'' مطبوعہ ۱۹۶۷ میں شامل ہیں۔

۱۹۸۰ء کے بعد جو نسل نئی غزل کے افق پر نمودار ہوئی ان میں نام تو بہت سے ہیں، مگر سب قابل قبول نہیں کیونکہ ان کی غزل میں وہ توانگری و توانائی نہیں ہے جو ان سے پہلی نسل کے غزل گو شعرا میں تھی، نہ وہ صحت لفظی نہ وہ معنوی تہہ داری، پھر بھی ہندوستان کی سطح پر چند نام ایسے ہیں جنھیں قطعی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ان میں فرحت احساس، مہتاب حیدر نقوی، اسلم محمود، شارق کیفی اور عالم خورشید نمایاں ہیں۔ میری یہ گفتگو ایک سرسری جائزہ ہے۔ مجھے کسی کا کسی سے کوئی موازنہ مقصود نہیں ہے۔ میرے نزدیک ادب وہی ہے جس میں تہہ داری ہو اور تفہیم و معنی کی مقررہ حدیں نہ ہوں۔ اخباری خبروں جیسا ادب میرے

PDF Compressor Free Version

لئے دلچسپی کا باعث نہیں ہے۔ شعر فہمی کے میرے اپنے پیمانے ہیں، اس باب میں میرا کسی سے کوئی اتفاق ہے نہ اختلاف۔ میں ادب کا ایک حقیر طالب علم ہوں اور ہر فن پارے کو اپنے زاویے سے دیکھتا ہوں۔

عالم خورشید کی غزل مسلسل ارتقا کی منزلوں سے گزر رہی ہے۔ ''خیال آباد'' کو آئے کافی عرصہ ہوگیا۔ درمیان میں ''کارزیاں'' آیا، پھر ''نہ یہ بستی ہماری، نہ وہ صحرا ہمارا'' نمودار ہوا جس نے احساس دلایا کہ شاعر ایک غیر مختتم افق کی طرف گامزن ہے اور اس کا ہر اگلا قدم نئے پانی میں ہوتا ہے۔ دیکھتے ہیں فن کار اور تخلیق سے متعلق عالم خورشید خود کیا کہتے ہیں:

> ''میں یہ نہیں مانتا کہ کسی مخصوص نظریے کے تحت ہی یا کسی خاص موضوع پر ہی اچھے یا بڑے ادب کی تخلیق ہوسکتی ہے، کسی بھی فن کار کی بہترین تخلیق اس کی انفرادی افتادِ طبع، احساس اور ذاتی تجربے کے سرچشمے ہی سے پھوٹتی ہے، اس لئے اچھے یا بڑے ادب کی تخلیق کے لئے اہمیت مجی محسوسات، عمیق تجربات و مشاہدات اور منفرد انداز پیش کش کی ہے، موضوع خواہ کوئی بھی ہو، فنکار کے اندر تخلیقی صلاحیت جس حد تک ہوگی، اسی حد تک اس کی تخلیق کرنے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ فن کار کے اندرون میں کوئی موضوع فطری طور پر اترے، ہلچل پیدا کرے اور پریشان کرے۔''

اس تحریر سے صاف ظاہر کہ عالم خورشید تخلیق ادب میں کسی تحریک یا رجحان کے قائل نہیں ہیں اور جدیدیت تو ویسے بھی ایک تجربے اور اسلوب کا نام ہے جس کی اپنی معنوی تہہ داری ہے اور وہ ان کے شعروں میں ہے۔ ترقی پسندیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت میں بنیادی بات تو یہی ہے کہ ترقی پسندیت، جدیدیت کے تو اپنے خدوخال ہیں جن سے ان کی شناخت ہوتی ہے، لیکن مابعد جدیدیت تو محض ایک نعرہ ہے جو باہر سے خوبصورت لگتا ہے، مگر اندر سے کھوکھلا ہے اور اگر یہ کچھ ہے بھی تو جدیدیت کی توسیع کے سوا کچھ نہیں۔ بہر حال اس تحریر میں میرا موضوع یہ سب کچھ نہیں ہے۔ میں عالم خورشید کی اس غزل پر کچھ بات کروں گا جو ان کے اس نئے شعری مجموعے میں سانس لے رہی ہے، لیکن اس سے پہلے اس پر غور کرنا ہوگا کہ انھوں نے اپنے شعری مجموعوں کے نام اس طرح کے کیوں رکھے؟ ان کے عقب میں کیا معنویت ہے اور ان سے نفسیات کے کن دیاروں کا سراغ ملتا ہے۔

عالم خورشید ان کا پہلا شعری مجموعہ نئے ''موسم کی تلاش'' ۱۹۸۸ میں شائع ہوا۔ امکان ہے کہ انھوں نے ۱۹۷۵ کے آس پاس شعر گوئی شروع کی ہوگی۔ ان کے اندر ایک جوش ولولہ اور نادر جذبات مسکن گزیں رہے ہوں گے کہ وہ کس طرح کے موسموں کی بہاروں کو اپنی غزلوں میں پیش کریں۔ ایسے اشعار تخلیق کریں جن سے بے پناہ تازگی و شادابی تراوش کرتی ہو۔ دوسرے مجموعے کا نام ''زہر گل'' تھا گویا پہلے مجموعے میں شامل کلام پر جو ردعمل سامنے آیا، تخلیق جو بظاہر پھول نظر آتی ہے اپنے باطن میں ایک زہریلا بچھو ہوتی ہے جب اسے نقد و نظر کی میزان پر رکھا جاتا ہے اور ہم اسے پھول سمجھتے رہتے ہیں پھر ''خیال آباد'' آیا جس میں ایک بے حد و دد نیا ہے۔ تخیل کی وہ شاہراہیں ہیں جن پر ہزاروں سنگ میلوں کی تنصیب ہے، ایک ایسی دنیا جہاں گلشن بھی ہیں اور صحرا بھی۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے جو توقعات وابستہ کر رکھی ہوں وہ پوری نہ ہوتی ہوں بہت سے خواب ایسے ہوتے ہیں جو کبھی تعبیر کے جہانوں تک پہونچ نہیں پاتے، اس لئے انھوں نے اپنے چوتھے مجموعے کا نام ''کارزیاں'' رکھا جس میں مایوسی و محرومی کی لہریں صاف نظر آتی ہیں، لیکن شاعر روداد محبت کے انجام سے واقف ہونے کے باوجود بھی سعی رائگاں میں مصروف ہے، ممکن ہے کہ انہیں تاثرات کے پیش نظر عالم خورشید نے اپنے پانچویں مجموعے کے آخر میں یہ تحریر لکھی ہو:

> ''میں نے کارزیاں کی اشاعت کے بعد ادبی فضا سے بیزار ہوکر شعر گوئی اور اشاعت کا سلسلہ تقریباً ترک کر دیا تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت ہرگز ممکن نہ تھی، اگر میرے کچھ دوست مجھے اکسا اکسا کر شعر گوئی کی طرف مائل نہ کرتے۔''

''بہر حال نہ یہ بستی ہماری، نہ یہ صحرا ہمارا'' ادب کے قارئین تک پہونچ گیا گویا ایک سایہ دار شجر جو اب تک اپنے بیج میں پوشیدہ تھا، نمودار ہوا، لیکن یہاں بھی احساس رائگانی کی تمازت موجود ہے، مگر یہاں عرفان کی وہ منزل بھی ہے جہاں قیس زحمت کش تنہائی صحرا نہیں رہتا، بادیہ پیمائی

PDF Compressor Free Version

ترک کر کے شہر میں آجاتا ہے، لیکن وہاں بھی اسے ایک صحرا نظر آتا ہے یہ وہ مقام ہے کہ جہاں در و دیوار سے بیابان قطرہ قطرہ ٹپکتا رہتا ہے۔ بہتر ہے کہ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ان اشعار پر نظر ڈالیں ۔

کوئی ستارہ ہاتھ پکڑ کر دور کہیں لے جاتا ہے
روز خلا میں کھو جانے کی آج بھی عادت باقی ہے

ہوتی رہتی ہے کہاں سے یہ دھوئیں کی یورش
میرے ملبے میں دبا کوئی شرارہ بھی ہے کیا

وصال جسم کی صورت نکل تو آتی ہے
دلوں میں ہجر کا موسم بحال رہتا ہے

بڑھتی جاتی ہے بے چینی ناخن کی
جیسے جیسے زخم پرانا ہوتا ہے

عشق اب ایک ہی معشوق سے منسوب نہیں
خوش بدن اور بھی ہیں ماہ رخاں اور بھی ہیں

مہ و نجوم عبث ہی چمک دکھاتے ہو
کبھی تو دیکھو ذرا آ کے میرے یار کا رنگ

غزل ہزار شیوہ صنف سخن ہے، حالانکہ یہ بات ہزاروں بار کہی جا چکی ہے، مگر اس کا لطف ختم نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ غزل میں مضامین اہم نہیں ہوتے اصل بیان و اسالیب ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی فن کار اگر اپنا انداز بیان اور منفرد اسلوب وضع کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے ایک تو یہ کہ اس نے فارسی اردو کلاسیکی غزل کا گہرا مطالعہ کیا ہے، دوئم یہ کہ وہ اپنے معاصرین میں صاحب طرز اسلوب نگار مان لیا گیا ہے، حالانکہ یہ منزل بہت مشکل سے ملتی ہے، لیکن مل بھی سکتی ہے، بس یہ کہ مشق اور گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔ عالم خورشید اس شہر کی سرحدوں تک رسائی حاصل کرتے جا رہے ہیں اور یہ بھی اس وقت ممکن ہوتا ہے جب فن کار بستی یا صحرا میں بود باش کا آرزومند نہ ہو پہلے شعر میں ستارے کا ہاتھ پکڑ کر دور لے جانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعر سیاحت سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ اسے کسی کے ساتھ سفر کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے وہ ان تمام احساسات سے ماورا ہے کہ یہ رہ گزاریں جن پر وہ محو سفر ہے اسے کہاں لے جائیں گی۔ دوسرے شعر میں راکھ میں چنگاریوں کا ہونا، پھر کسی شے کے سلگتے رہنے کی طرف ہمارا خیال مبذول کرتا ہے۔ یعنی راکھ میں کیا پوشیدہ ہے؟ یہاں دل جلا نہیں ہے، راکھ کا کریدنا عبث نہیں ہے، بلکہ اس میں کچھ چنگاریاں موجود ہیں۔ مجھے یہاں مصور سبزواری کا یہ شعر یاد آتا ہے ۔

شام ہوتے ہیں کچھ احساس زیاں مجھ کو ہوا
راکھ کے ڈھیر میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا وہ بھی

عالم خورشید کا تیسرا شعر ہمیں واضح طور پر بتاتا ہے کہ اتصال جسم کا نہیں روح کا ہوتا ہے۔ دریا کے دو کنارے ہیں، مگر دونوں اجنبی ہیں جب کہ دریا ایک ہی ہے اور اسی سے دونوں وابستہ ہیں، مگر کبھی ملتے نہیں بیدل نے کیا خوبصورت شعر کہا ہے ۔

ہمہ عمر ما تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

اسی طرح باقی کے دو اشعار بھی ہمیں روایتی غزل کے تار و پود کی طرف لے جاتے ہیں، لیکن اسلوب کی تازگی نے ان اشعار کو ہمارے عہد کا مکالمہ بنا دیا ہے۔ آج کا عشق پہلے جیسا نہیں ہے کہ ایک ہی پر اکتفا کریں، ایک ہی کے لئے مریں، مسلسل وصل کے لئے ہاتھ پیر مارتے رہیں۔ اب عشق کوئی مسئلہ نہیں ہے، وصل بہت آسان ہے، بقول فضیل جعفری نہ اب غزل میں لیلیٰ سر پھوڑ کر مرتی ہے اور نہ عشاق لحد سے اٹھ کر بھاگتے ہیں۔ آخری شعر ہمیں فراق کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جسے چاند ستاروں سے حجاب آتا ہے، اسی کے نقش قدم سے چراغ جلتے چلے جا رہے ہیں یعنی ماہ و نجوم میں کیا رکھا ہے، ماہ و نجوم تو معشوق کے قدموں تلے موجود ہیں۔ عالم خورشید نے اس خیال کو ایک نئی تازگی دی ہے جو ان کا منفرد اسلوب ہے۔

مجھے عالم خورشید کا یہ شعری مجموعہ ان کے پہلے کے شعری مجموعوں سے بہت منفرد نظر آتا ہے۔ وہ اردو غزل کے اصل مزاج تک پہونچ چکے ہیں۔ چند شعر اور قابل مطالعہ ہیں ۔

(بقیہ ص ۴۳ پر)

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر فصیح الدین احمد
Deptt. of Urdu, B.N. Mandal University, Madhepura

فیضؔ کی مزاحمتی نفسیات: ایک جائزہ

("نقش فریادی" اور "دست صبا" کے حوالے سے)

فیضؔ کے یہاں مزاحمتی عناصر بدرجہ اتم نمایاں ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تخلیق فن کا سنگ بنیاد مزاحمت کی نفسیات ہے۔ فن رومانیت اور جمالیات کی ہم آہنگی سے عبارت سہی، لیکن Dissent یعنی اختلاف وانحراف یا مزاحمت اس کی روح رواں ہے۔ یہ عنصر تخلیق فن میں جتنا نمایاں ہوگا اس کی مناسبت سے فن میں انفرادیت اور امتیاز کی جلوہ گری ہوگی، لیکن مزاحمت کا مہذب فن کارانہ اظہار بنیادی شرط ہے۔

فیضؔ کے یہاں مزاحمتی عناصر کی کارفرمائی شروع سے ہی موجود رہی ہے۔ مزاحمت بلاشبہ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے جو بعض نظموں میں زیریں لہر کی طرح اور بعض تخلیقات میں فعال روح کی طرح موجود ہے۔ ان کی ابتدائی غزل کا درج ذیل شعر ؎

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

ایک اہم موڑ کی نشاندہی کرتا ہے جو آگے چل کر "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" یا "ترانہ" وغیرہ جیسی اہم نظموں کے معرض وجود میں آنے کا باعث بنتا ہے۔ ایسی ان گنت مثالیں کلام فیضؔ میں تلاش کی جاسکتی ہیں، لیکن اس کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ فیضؔ نے صرف مزاحمتی نفسیات کی پیش کشی تک ہی خود کو محدود رکھا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے اور دوسرے احساسات بھی معنی خیز اشعار کی شکل میں ان کے یہاں روشن ہوئے ہیں۔ خیر ان باتوں سے قطع نظر میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ فیضؔ کی مزاحمتی شاعری کے دائرے میں خالق کائنات بھی ہے اور عصری معاشرہ بھی۔ فیضؔ کے بیشتر معاصرین نے صدیوں سے چلی آرہی اس روایت کی توسیع وتجدید کی مخلصانہ کوشش کی، لیکن ان کے یہاں فن کارانہ انضباط، توازن اور سلیقہ گفتار کی نمایاں کمی ہے۔ مثلاً جوشؔ کا یہ شعر۔

شبیر حسن خاں نہیں لیتے بدلہ
شبیر حسن خان سے بھی چھوٹا ہے خدا

سلیقہ گفتار کی نمایاں کمی کی مثال میں ایک علامتی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں پر میرا مقصد جوشؔ کی توہین وتخفیف نہیں۔ بلاشبہ جوشؔ ایک اہم اور منفرد شاعر تھے اور اختلاف ومزاحمت کا سرفروشانہ جذبہ بھی رکھتے تھے، لیکن کہیں نہ کہیں ایک آنچ کی کمی نے ان کی فن کارانہ عظمت وشوکت پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ یہی حال فیضؔ کے بعد دوسرے شعرا کا بھی ہوا۔ ترقی پسند شعرا میں فیضؔ کے یہاں اقبالؔ کی شعری جمالیات کی توسیع و تجدید زیادہ فن کارانہ سطح پر ہوئی ہے۔ اقبالؔ پر فیضؔ کی نظم اس جہت سے علامتی معنویت رکھتی ہے۔ تین بندوں پر مشتمل یہ نظم دیکھئے ؎

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہوگئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا

اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیش کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں

PDF Compressor Free Version

پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثل شعلہ جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے، بادِ فنا کا جگر، گداز
جیسے چراغ، وحشت صرصر سے بے خطر
یا شمع بزم، صبح کی آمد سے بے خبر

اسی طرح اقبال کی ایک مشہور نظم "دعا" ہے جو "بال جبریل" میں شریک اشاعت ہے۔ نظم کا آغاز درج ذیل انداز میں ہوا ہے ۔

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
مری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
محبت اہل صفا نور و حضور و سرور
سرخوش و پرسوز ہے لالہ لب آب جو
راہ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ میرے رہ گئی ایک میری آرزو
میرا نشیمن نہیں درگہہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا مطلع صبح نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتش اللہ ہو!

گیارہ اشعار پر مشتمل اس نظم کا دسواں شعر ملاحظہ فرمائیں ۔

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں، میرے لئے چار سو

اس طرح فیض کی بھی ایک مشہور نظم "دعا" ہے جس میں وہی شکوہ، گلہ، انحراف، اختلاف، احتجاج اور مزاحمت موجود ہے جو شعریات اقبال کی نمایاں خصوصیت ہے اور جو فیض کے بعد شاید کسی دوسرے کے حصہ میں نہیں آئی۔ یہی فیض کی تخصیص ہے۔ میرا خیال ہے کہ فیض نے یہ ہنر اقبال سے اور اقبال نے غالب سے اور غالب نے بیدل سے حاصل کیا۔ بہرکیف فیض کی مذکورہ نظم "دعا" کے یہ اشعار دیکھئے ۔

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسم دعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوز محبت کے سوا
کوئی بت، کوئی خدا یاد نہیں

آیئے عرض گزاریں کہ نگار ہستی
زہر امروز میں شیرینی فردا بھر دے
وہ جنہیں تاب گراں باریٔ ایام نہیں
ان کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کردے
جن کی آنکھوں کو رخ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمع منور کردے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اُجاگر کردے

جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے ان کو
ہمت کفر ملے، جرأت تحقیق ملے
جن کے سر منتظر تیغ جفا ہیں ان کو
دست قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

عشق کا سرنہاں جان تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرف حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

اقبال اور فیض کی مذکورہ نظموں میں بہ ظاہر کوئی مناسبت نہیں، لیکن احساسات کی سطح پر جو باغیانہ لب ولہجہ، اختلاف وانحراف اور مزاحمت ہے وہ کسی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ فیض نے اپنی متعدد نظموں اور غزلوں میں اپنے اس مزاحمتی فکر و احساس کا خوبصورت اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے پہلے مجموعہ "کلام نقش" فریادی کو سامنے رکھا جاسکتا ہے۔ اس مجموعے کا آغاز غالب کے درج ذیل شعر سے ہوتا ہے ۔

PDF Compressor Free Version

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا

پھر اس سرنامے کے تحت دو قطعات اور ایک نظم ''خدا وہ وقت نہ لائے'' ملتی ہے۔ یہ دور فیض کی شاعری کا خالص رومانی دور ہے۔ اس دور میں وہ ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جو فطرت کی رفاقت میں شوق، انتظار، اداسی اور تنہائی کے احساسات سے دوچار ہے۔ ان کے عشقیہ تجربات میں حسن اور جاذبیت ہے۔ وہ حسیاتی لذت آگینی سے بھی پوری طرح مملو ہیں، لیکن اس کے بعد ان کے جذبہ عشق میں پختگی اور صلابت آجاتی ہے چنانچہ انہوں نے ''نقش فریادی'' کے دوسرے حصہ کے لئے سرنامے کے طور پر عرفی کے درج ذیل شعر کا انتخاب کیا۔

بروائے عقل و منہ منطق و حکمت در پیش
کہ مرا نسخۂ غم ہائے فلاں در پیش است

اس میں ''سرد و شبانہ''، ''آخری خط''، ''مری جان اب بھی'' اور ''تہہ نجوم'' جیسی کامیاب، پر اثر اور خوبصورت مزاحمتی نظمیں موجود ہیں۔ ان نظموں اور کچھ غزلوں کے بعد فیض نے ''نقش فریادی'' کے تیسرے حصے کے لئے ایک الگ سرنامہ قائم کیا ہے جس کے لئے انہوں نے نظامی کا درج ذیل مصرع منتخب کیا ہے ع

دلی بفروختم، جانی خریدم

اس سرنامے کے بعد پہلی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' سامنے آتی ہے۔ یہ نظم بہت مشہور ہے، جس میں شاعر کے ہمت آفریں شجاعانہ جذبات کا بے ساختہ و پر خلوص اظہار ملتا ہے۔ اس میں فیض نے اپنے آدرش کو محبوب کی حیثیت دی ہے۔ انہوں نے دنیا کے ظلم و جبر، ناانصافی، عدم مساوات اور خود غرضی کے مقابلے میں اپنے اسی محبوب کی تشکیل و تجسیم کی ہے۔ یہ محبوب اشتراکی احتجاج و انقلاب کا استعارہ ہے۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

یہ نظم کا تمہیدی حصہ ہے اس کے بعد گریز کی منزل آتی ہے جو سفاک حقیقت پسندی کا باغیانہ لب و لہجہ رکھتی ہے مثلاً۔

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے، خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجئے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

یہیں سے فیض کی شاعری میں احتجاج اور مزاحمت کا وہ رجحان پیدا ہوا جس نے ان کو اقبال کے بعد اردو کے سب سے اہم شاعر کی حیثیت بخشی، بہ طور خاص ان کی نظم ''سوچ''، ''رقیب سے''، ''چند روز اور میری جان''، ''کتے'' اور ''بول'' وغیرہ ایسی لافانی نظمیں ہیں جن میں فیض کا مزاحمتی میلان زیادہ کھل کر سامنے آیا۔ ''کتے'' اور ''نقش فریادی'' کی ایک دلکش اور بے حد پر اثر علامتی نظم ہے۔ یہ ان لاکھوں مظلوم لوگوں کی کہانی ہے جو ایک ایسی زندگی جینے پر مجبور ہیں جو کتوں کی زندگی سے مشابہ ہے۔

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوق گدائی
زمانے کی پھٹکار سرمایہ ان کا
جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

PDF Compressor Free Version

نہ آرام شب کو نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

"بول" بھی فیضؔ کی ایک گراں قدر نظم ہے جو ایک دلکش جمالیاتی اظہار کی شکل میں روشن ہوئی ہے۔ اس نظم میں فیضؔ نے انگریزی حکومت اور اس کے پیدا کردہ دشمن رویوں کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے۔ نظم کا آغاز ہی رجزیہ آہنگ سے ہوتا ہے ۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے/ بول، زباں اب تک تیری ہے/
تیرا ستواں جسم ہے تیرا/ بول کہ جاں اب تک تیری ہے/ دیکھ
کہ آہنگر کی دکاں میں/ تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن/ کھلنے
لگے قفلوں کے دہانے/ پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن/ بول، یہ
تھوڑا وقت بہت ہے/ جسم و زباں کی موت سے پہلے/
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک/ بول، جو کچھ کہنا ہے، کہہ لے

نظم ارتقائی صورت میں بڑھتے ہوئے آخر میں ایک توازن کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"فیضؔ صاحب کی بارہ مصرعوں کی نظم 'بول' کو ان کا عہد نامہ اور The Testament of the third world کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ نظم آج سے کم و بیش پچاس سال پہلے کہی گئی تھی جب برٹش راج اپنے عروج پر تھا اور زبان کھولنے پر قدغن تھی۔ اس میں ان کے جری لہجے کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ مدھم، مگر مضبوط سروں کی اٹھان کے بعد وہ اپنی رجز کی لے تیز کر دیتے ہیں۔ چوتھی لائن کے بعد ٹیمپو بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ رجز خواں کے نفس گرم کی آنچ محسوس ہونے لگتی ہے اور آخری بند میں عہد عتیق کی بشارتوں کا جاہ و جلال گونجتا ہے۔"

مشتاق احمد یوسفی کی یہ رائے حقیقت پسندانہ انداز نظر کی حامل ہے۔ اسی طرح "نقش فریادی" میں "ہم لوگ" اور "شاہراہ" بھی کامیاب نظموں میں شمار کی جاتی ہیں اور ان میں بھی مزاحمتی لہجے کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ لہجہ شاعر کے آشوب آگہی کا پتہ دیتا ہے، لیکن اس لہجے پر نہ تو شکست و مایوسی اور ناامیدی کے آثار نمایاں ہیں اور نہ ہی لہجے پر الم نصیبی اور جگر فگاری کا دکھ ہے۔ امید و یقیں بلاشبہ شاعر کی میراث ہے جو اپنی مختلف کیفیتوں میں روشن و منور ہوئی ہے۔

"دست صبا" فیضؔ کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ فیضؔ اس وقت اسیر زنداں تھے اس کے باوجود نہ تو ان کے یہاں قنوطیت ہے اور نہ ہی مایوسی اور نہ ہی عملی زندگی سے فرار بلکہ ان کی شاعری جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ خود فیضؔ نے بھی "دست صبا" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا تقاضہ ہی نہیں فن کا بھی تقاضہ ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "دست صبا" کا آغاز ہی ایک ایسے شعر سے ہوتا ہے جس میں احتجاج اور انقلاب کی شمع روشن ہے ۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

یہ نظم درد کی انتہائی شدت کے ساتھ انتہائی تسکین کی بھی مظہر ہے۔ اس میں ایمان و ایقان کی جگمگاہٹ بھی ہے۔ اس میں انسانی حوصلہ، عزم اور حکمت کا راز بھی الاپا گیا ہے۔ ایسا حوصلہ، عزم اور حکمت فیضؔ کی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے بعد جو پہلی نظم سامنے آتی ہے وہ "اے دل بیتاب ٹھہر" ہے۔ اس کا آخری بند خاص طور سے ملاحظہ کیجئے ۔

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد ہی یہ سطوت اسباب بھی اٹھ جائے گی
یہ گرانباری آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے

PDF Compressor Free Version

یہ نظم فیضؔ کی مزاحمتی نفسیات کا بے حد حسین استعارہ ہے۔ ''سیاسی لیڈر کے نام'' بھی ایک خوبصورت نظم ہے۔ نظم کا ہر مصرع ایک دوسرے سے گہرے طور پر مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ اسلوب کی جدت کاری نے اسے ایک دلچسپ تخلیقی تجربہ بنا دیا ہے۔ جامعیت اور معنویت کے اعتبار سے اس میں شاعر کا مزاحمتی رویہ انسان دوستی کا غماز ہے۔ ''میرے ہمدم میرے دوست'' بھی ایک کامیاب تخلیقی تجربہ ہے۔ نظم کا یہ آخری بند دیکھئے ۔

نغمہ جراح نہیں مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں ، مرہم آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا ، تیرے سوا ، تیرے سوا

اگلی نظم ''صبح آزادی'' ہے جس کا موضوع تقسیم ہند ہے۔ اس موضوع پر اردو میں بہت ساری نظمیں ملتی ہیں، لیکن فیضؔ کی یہ نظم ایسی تمام نظموں میں اولیت رکھتی ہے۔ فیضؔ نے امن و آزادی کے آدرش کو اپنا مقصد حیات بنایا تھا جس کے دائرے میں انصاف، انسانیت دوستی، جمہوریت، مساوات اور اخوت و محبت کی قدریں کارفرما تھیں مگر وہ تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ المیہ اور حسرت ناک انجام کا نوحہ بن گئیں۔ انوکھے موضوع، نادر تکنیک، ترکیب و بندش اور تشبیہ و استعارے کی جدت اور تجسیم کاری کے حسن نے اس نظم کو اثر و تاثر کا حامل بنا دیا ہے۔ یہ بند دیکھئے جو فیضؔ کی مزاحمتی نفسیات اور تجربات و احساسات کا انتہائی دردمندانہ اظہار ہے ۔

جگر کی آگ ، نظر کی امنگ ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا ، کدھر کو گئی
ابھی چراغ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اس کے بعد ''لوح و قلم'' جیسی بے پناہ تخلیق ملتی ہے۔ یہ نظم فیضؔ کے اجتماعی اور مزاحمتی رویہ کی بہت خوبصورت علامت کے طور پر روشن ہوئی ہے ۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسباب غم عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانی دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی ، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
میخانہ سلامت ہے تو ہم سرخی مے سے
تزئین در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

''دو عشق'' بھی ایک خوبصورت مزاحمتی نظم ہے۔ اس نظم میں فیضؔ نے اپنے خلوص، یکسوئی اور جذبہ ایثار کا کامیاب اظہار کیا ہے۔ اس میں فیضؔ نے اپنے دو عشق کو موضوع بنایا ہے۔ پہلا عشق نوجوانی کا ہے جو کسی جیتے جاگتے انسانی پیکر سے متعلق ہے اور دوسرا عشق محبوب مادر وطن سے ہے جس کے لئے فیضؔ نے ایک مخصوص سیاسی اور اقتصادی نظریہ کو محبوب کی حیثیت دی ہے، لیکن بنیادی طور پر اشتراکیت سے فیضؔ کا عاشقانہ ربط مادر وطن سے محبت کا رہین منت ہے۔ یہ نظم دو بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں شاعر نے جوانی کی ذہنی و جذباتی وابستگی کا دلکش مزاحمتی اظہار کیا ہے۔ مزاحمتی لہجہ کے اس حسن نے نظم کو دلکش تاثرات کا حامل بنا دیا ہے۔ شاعر کی تصویر کشی میں ڈرامائی اور تمثیلی ہنرمندی نمایاں ہے اور ہجر و وصال کی مختلف کیفیتیں بھرپور شخصی تاثرات کے ساتھ پیکر تراشی کی فنکارانہ ہنرمندی سے مملو نظر آتی ہے۔ دوسرے بند میں شاعر بڑی والہانہ ربودگی و فتادگی کے ساتھ اظہار کرتا ہے کہ اس نے وطن عزیز سے اسی طرح محبت کی ہے جس طرح اس نے انسانی پیکر سے کی ہے ۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائش منزل
رخسار کے خم میں ، کبھی کاکل کی شکن میں

PDF Compressor Free Version

اس جان جہاں کو بھی یونہی قلب ونظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی، کبھی رو رو کے پکارا
پورے کیے سب حرف تمنا کے تقاضے
ہر درد کو اجیالا ، ہر اک غم کو سنوارا
واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریت جاں ، راحت تن ، صحت داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی

وطن عزیز سے یہ جذباتی لگاؤ شاعر کے خلوص، صداقت اور ایثار و محبت کا بین ثبوت ہے۔ شاعر بڑے ہی فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ اس نے وطن عزیز کی محبت میں حرف تمنا کے تمام تقاضوں کی تکمیل کی ہے۔ ظاہر ہے راہ عشق میں جو سچے عاشقوں پر گزرتی ہے وہ اس پر بھی گزری۔ وہ کبھی تنہا پس زنداں اور کبھی رسوا سر بازار رہا ہے۔ غیروں نے ہر ناوک دشنام اور اپنوں نے ہر طنز و ملامت کا ہدف اسے بنایا، لیکن اس کے جذبہ محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کے پائے استقامت میں کبھی لغزش پیدا نہیں ہوئی اس لئے کہ اس نے محبت کے ظلم و ستم کے تمام داغ اپنے سینے پہ اٹھائے، مگر ندامت کے داغ سے اپنے دل کو محفوظ رکھا۔ اسی میں اس کی محبت کی تقدیس کا راز پنہاں ہے۔ ایسی اور بھی متعدد مثالیں کلام فیض سے دی جاسکتی ہیں، لیکن ''شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں'' کا ذکر کئے بغیر یہ مضمون نامکمل رہے گا۔ یہ فیض کے انقلابی تصور کا ایک شاندار استعارہ ہے۔ نظم کے آخری کچھ حصے دیکھئے ۔

کبھی لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں
کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ، ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں
کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں
ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی ، نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر
یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں
سب ساغر ، شیشے ، لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو ، سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

فیض نے اس نظم میں انسانیت نواز روایت سے اپنی وابستگی کا بھرپور اظہار کیا ہے محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں اور دکھ درد کے مارے ہوئے انسانوں کی حمایت میں حاکم وقت کے سامنے بھی سینہ سپر ہو کر اپنی بے پناہ مزاحمت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ناداری، دفتر، بھوک اور غم کے چوکھٹ پتھراؤ نے شاعر کے شیشہ دل کو پاش پاش کر دیا ہے۔ اس کے خلاف بھی ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ بقول لطف الرحمٰن:

> ''شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، فیضیات کا اہم باب ہے۔ یہ نظم اپنی سلاست، روانی، بے ساختگی، فطری انضباط اور جذباتی التہاب کے لحاظ سے اردو نظم میں معنی آفرینی کی ایک خوبصورت علامت ہے۔ نظم اجتماعی جدوجہد کی دعوت اور رجائی تمنا آفرینی پر ختم ہوتی ہے۔''

بہرکیف یہ ایک حقیقت ہے کہ فیض کے یہاں مزاحمتی عناصر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

متھن کمار

Assistant Professor, Deptt. of Urdu, Delhi University, Delhi 110007

سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری کے چند نقوش

اردو افسانے کی زائد از صد سالہ شاندار اور درخشاں تاریخ میں سہیل عظیم آبادی ایک ایسا افسانہ نگار ہے جس نے اپنے افسانوں کی بدولت اس میدان میں ایسی شہرت اور مقبولیت حاصل کی جو ہر کسی کے نصیب نہیں آسکی۔

سہیل عظیم آبادی ۱۹۱۱ء میں پٹنہ کے ایک چھوٹے سے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش اور ابتدائی تعلیم ان کی نانیہال میں ہوئی، پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ مظفر پور چلے گئے۔ زندگی کی تگ ودو میں کلکتہ اور حیدر آباد میں قیام رہا۔ ناگپور، دہلی اور شرینگر میں بھی کچھ دنوں تک ملازمت کے سلسلے میں قیام پذیر رہے، مگر آخر کار پٹنہ سے ہی ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی۔ یوں تو انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی تھی، مگر جلد ہی علامہ جمیل مظہری کی رائے سے احساس ہوا کہ ان کا اصل میدان شاعری نہیں بلکہ افسانہ نگاری ہے۔ انہوں نے صحافتی میدان میں بھی خوب خوب زور آزمائی کی اور روزنامہ ''ساتھی'' ہفتہ وار ''حال'' اور ایک رسالہ ''تہذیب'' نکالا۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے مطابق:

> ''سہیل عظیم آبادی نے کل ۱۲۵ افسانے لکھے جن میں کل ۳۳ افسانے ہی ان کے افسانوی مجموعے میں شامل ہیں، بقیہ بانوے افسانے مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔''

تمام ادیبوں کی طرح سہیل عظیم آبادی بھی اپنے ہم عصر ادبی ماحول اور اپنی ہم عصر ادبی شخصیات سے متاثر تھے۔ جس دور میں انہوں نے لکھنا شروع کیا اس وقت اردو میں پریم چند کی تحریروں کا دور دورہ تھا۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کا ادبی حلقوں میں شور مچا ہوا تھا۔ اردو ادب کا افق متغیر اور متبدل ہو کر نئے منظر نامے کی تعمیر کر رہا تھا۔ اب وہ خواص سے عوام کی طرف کروٹ لے رہا تھا اور اپنا رخ محلوں سے گاؤں کی طرف کر رہا تھا۔ وہ حقیقت نگاری اور اصلاح پسندی کی زمین پر حسن کے ''اصل معیار'' کی شناخت کر کے اس کے مسائل و موضوعات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ تخیل سے نکل کر حقیقت کی زمین پر انسانوں کے دکھ درد اور جذبات و کیفیات سے خود کو روبرو کرا رہا تھا۔ جھونپڑیوں اور گندگی میں زندگی کے شب و روز گزارنے والے دبے کچلے اور استحصال زدہ لوگوں کی چیخ و پکار اور ان کی آہیں اس میں شامل ہو رہی تھیں۔ جس دیہی زندگی کی طرف ابھی تک اردو ادب نے خاطر خواہ نظر نہیں ڈالی تھی، اب اسی گاؤں کی پگڈنڈیوں پر وہ گامزن تھا۔ غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کے مرجھائے ہوئے چہروں کی مایوسی اور نا امیدی کے اسباب و علل کی نشاندہی کر رہا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نہ صرف ان کی نشاندہی کر رہا تھا بلکہ بلا واسطہ طور پر ان سے نجات حاصل کرنے کی تبلیغ بھی کر رہا تھا۔ استحصال پر مبنی زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام پر چوٹیں کرتے ہوئے کسانوں اور مزدوروں کی بے بسی اور بے کسی ہی نہیں بلکہ زمینداروں کی بے حسی کو بھی پیش کر رہا تھا۔ اس ادبی فضا خصوصاً پریم چند، سدرشن اور ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک نے سہیل عظیم آبادی کو بہت متاثر کیا۔ اس بابت وہ لکھتے ہیں:

> ''میں جن افسانہ نگاروں سے متاثر ہوا ان میں سب سے پہلا نام منشی پریم چند کا ہے۔ ان کے بعد سدرشن اور روسی لکھنے والے غیر ملکی افسانہ نگاروں میں ٹالسٹائی، چیخوف، موپاساں اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی متاثر کیا، لیکن میں سب سے زیادہ پریم چند، ٹالسٹائی سے متاثر رہا ہوں۔'' (سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے، ص ۸ و ص ۹)

PDF Compressor Free Version

مزید یہ کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں جمہوریت کی آمد آمد تھی اور عوام کو ملک میں حکومت کی تعمیر کرنے، اس میں شامل ہونے کے برابر مواقع فراہم ہونے تھے۔ ایک طرف انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد ہو رہی تھی تو دوسری طرف عوام میں اسی جدوجہد کے سبب بیداری بھی پیدا ہو رہی تھی۔ ملوں اور کارخانوں میں یونینوں کا قیام عمل میں آ رہا تھا اور مزدور اپنے حق وحقوق کے تئیں محتاط ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت کی باگ ڈور عوام کے ہاتھوں میں آنے والی ہو اور عوام بیدار ہو رہے ہوں تو بھلا ادب اس عمل میں کیوں پیچھے رہتا۔ اردو ادب کی تو تاریخ شاہد ہے کہ یہ ہمیشہ ان کے جذبات کا ترجمان رہا ہے جن کے ہاتھوں میں حکومت یا اقتدار ہو، اس لئے جب سیاسی سطح پر عوام کے ہاتھوں میں طاقت آنے لگی تو رفتہ رفتہ اردو ادب نے بھی اپنا رخ اسی طرف کر لیا۔

سہیل عظیم آبادی ہندوستان کے اس سیاسی اور سماجی پس منظر اور اردو کے ادبی منظرنامے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے افسانوں میں جا بجا ایسے مناظر نظر آتے ہیں جن سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سہیل عظیم آبادی پریم چند کے اصل پیروکار تھے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال ان کا افسانہ ''الاؤ'' ہے جس میں دیہی زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کے استحصالی رویے کو پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کے صفحۂ اول پر ہی درج ہے کہ:

''گاؤں میں اب کسان ہی کسان رہتے ہیں۔ پرجا ہی پرجا۔ راجا کو مرے، برباد ہوئے تو زمانہ گزر گیا۔''

یعنی بادشاہ اور راج رجواڑوں کا زمانہ ختم اور جمہوریت کی آمد آمد ہے۔ اب تو صرف پرجا یعنی عوام کی حکومت ہوگی۔ سانول، بھاگو اور دلو اس افسانے کے سب سے فعال، متحرک اور انقلابی کردار ہیں۔ بھاگو زمیندار کے ظلم وستم سے نجات حاصل کرنے کے لئے کسانوں کے متحد ہونے پر زور دیتا ہے اور بزرگوں کی حوصلہ شکن باتوں کو نظر انداز کر کے اپنے ہم عمر نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ وہ طوفانی میاں کی ''خدائی کارخانے'' اور ''چھکو تیلی کی'' پرماتما نے سدا کے لئے آدمی کو چھوٹا بڑا بنایا ہے۔'' جیسی باتوں کو رد کر دیتا ہے۔ سانول بہت ہی تیز اور غصہ ور قسم کا نوجوان ہے، جو بات بات پر مار پیٹ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یہ تینوں ایسے کردار ہیں جو کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کرنے والے اور ان کا سر کچلنے کا دعویٰ کرنے والے زمیندارانہ نظام کے ظلم وستم کے خلاف صدائے حق واحتجاج بلند کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل چند جملے اس بات کی تائید کرتے ہیں:

''اپنے کئے سب کچھ ہو سکتا ہے۔''

''ہم لوگوں کو اب تیار ہونا ہی پڑے گا۔''

''یہ سب اب نہیں چل سکتا۔ کل میگھو کو کہا جائے کہ وہ بھی کام کرنے نہ جائے۔''

''پٹواری جی کو رسید نہ دیا جائے۔ دباؤ ڈال کر دودھ، گھی وصول کر لیتے ہیں وہ بھی بند اور بیگار آخری طور پر بند۔''

''بولو اب کیا ارادہ ہے، اب عزت چاہتے ہو یا ذلت۔''

''تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اگر تم زمین لال کرنا چاہتے ہو تو کنڈی کو ہاتھ لگاؤ۔''

''کچھ کرنا چاہئے۔ اگر چپ رہے تو مطلب یہ کہ پٹواری جی من مانی کرتے جائیں گے۔ اب جو بھی ہو۔''

افسانے کے مذکورہ بالا سطور غریب کسان نوجوانوں کے خون کی تیزی اور کچھ کر گزرنے کی ہمت وحوصلہ، ظلم وبربریت کے خلاف جدوجہد کا بیانگ دہل اعلان کرتے ہیں۔ یہ نوجوان گاؤں کے دوسرے کسانوں کو نہ صرف اس جدوجہد میں شامل کرتے ہیں بلکہ انہیں اس نظام کے مظالم سے آگاہ بھی کرتے ہیں۔ افسانے کا عنوان بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کے داخلی جذبات وکیفیات کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس طرح الاؤ کی تپش اور تیزی سردی سے نبرد آزما ہو کر انسانوں کو اس سے محفوظ رکھتی ہے اسی طرح ان کی داخلی کیفیت، ہمت وحوصلہ، خون کی گرمی، قہر آلود نظریں اور انقلابی اذہان، استحصال پر مبنی اس نظام سے انہیں نجات دلا سکتے ہیں۔ بھاگو کا لاٹھی میں اچھا گڑ اسا لگانے کی بات کہنا دراصل اس انقلاب کی طرف اشارہ ہے جس میں خون کی بوندیں شامل ہیں۔ افسانے کا آخری منظر پریم چند کے افسانے ''پوس کی رات'' کے ہلکو کی یاد تازہ کراتا ہے جہاں وہ سردی دور کرنے

PDF Compressor Free Version

کے لئے باغ میں آگ تاپتا ہے۔ زمینداری کے خاتمے کے موضوع پر ان کے افسانہ ''جینے کے لئے'' کا گوبردھن صرف اس لئے بے چین و بے قرار ہے کیونکہ صبح اس کو اور گاؤں والوں کو زمیندار نے بلایا ہے۔ دراصل نئے سرکاری قانون کے مطابق، جو زمین جوتے گا اس پر اسی کا حق ہوگا، اسی لئے دوسرے دن، صبح زمینداروں نے یہ فرمان سنادیا کہ اب گاؤں کے کسانوں سے ان کی زمین واپس لی جاتی ہے۔ انہیں لگنے لگا کہ اگر زمین ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تو ان کا کیا ہوگا۔ کسانوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا، مگر ان لوگوں نے اپنا حوصلہ ٹوٹنے نہ دیا، اس لئے انہوں نے بھی طے کیا کہ اگر وہ زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرنے جائیں گے تو پانچ سیر مزدوری لیں گے۔

ظاہر ہے اس عمل میں ایک طرف اپنی جائیداد کا تحفظ ہے تو دوسری طرف زندگی کو جینے کی جدوجہد میں زیادہ مزدوری کی اپنی شرطیں۔ یہ ایک طبقاتی کشمکش کی بنیاد تھی جس میں سرو بار اطبقے نے سرمایہ داروں کو مات دے دی۔ گوبردھن نے کھیتوں میں ہل چلادیا تو گاؤں کے دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس عمل میں نہ صرف کھیتوں میں کام کرنے والے بلکہ زمیندار کے نوکر بھی ان کسانوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ وجہ صرف یہ کہ دونوں کے مسائل حیات یکساں ہیں۔ افسانے کے آخری دو جملے نئی صبح کی نئی روشنی، نئی امیدیں، ایک نئے آغاز اور نئے طرز فکر و عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جیل میں گوبردھن نے رام لال سے کہا:

''رام لال بھائی! ایسا نہیں ہوسکتا کہ گائے بھوکی مرے اور سور کھا کر اگھائے..... رام لال بھائی! جینے کے لئے مرنا بھی ہوگا۔''

موت کا ایک دن متعین ہے، پھر کیوں نہ ''زندگی'' کا استعمال ''زندگی'' کو بنانے کے لئے کیا جائے، بھلے ہی ''زندگی'' کا خاتمہ ہوجائے۔ وہاب اشرفی نے سہیل عظیم آبادی کے اس افسانے کو لالو کے کرداروں کے خواب کی تعبیر کہا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا افسانہ ''دو مزدور'' بھی کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کی بیداری اور مزدور یونین کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ بلاقی ایک متحرک اور بیدار مغز مزدور ہے۔ اسے کارخانے کے عملے سے شکایت ہے جو مزدوروں کو طرح طرح کی ترکیبوں سے پریشان کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ کارخانے کے بابو کو گالیاں دیتا ہے:

''سالے نے پھر گیر حاجر (غیر حاضر) بنادیا جمرو بھائی! بڑا کھچڑا ہے سالا..... تم بھی جمرو بھائی کیسی بات کرتے ہو۔ کھوسامد (خوشامد) کا ہے کی۔ بھیک تھوڑے دیتا ہے سالا۔ اب کی بدمعاشی کرے گا تو دیں گے دو پھیٹ .....ارے بھیا! جو جی میں آئے کہہ لو۔ یونین نہیں ہے یہاں۔ نہیں تو تین چار دن میں ہوش آجاتا سب کو۔''

مذکورہ بالا سطور اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کارخانے کے مزدوروں کو اپنی یونین میں ہی اپنے حقوق کا تحفظ نظر آتا ہے۔ وہ کارخانے کے مالکوں کی خوشامد کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ انہیں اپنی زندگی کے شب و روز گزارنے کے لئے اپنی قوت بازو پر پورا اعتماد ہے۔

سہیل عظیم آبادی جب بھی مزدوروں اور کسانوں پر کوئی افسانہ رقم کرتے ہیں تو الاؤ جیسی کوئی نہ کوئی گرم شئے ضرور ہوتی ہے جو نوجوان کرداروں کے جوش و جذبے اور ان کی بلند حوصلگی کی عکاسی کرتی ہے، حالانکہ پرانے خیالات کے بزرگ ان کے اس جذبے کو پاگل پن قرار دیتے ہیں۔ یہ دو نسلوں کے درمیان ان کے انداز فکر کے فرق کی عمدہ مثال ہے۔ پرانی نسل کی پست ہمتی ان کے متواتر استحصال کا نتیجہ ہے جس نے ان کی بے بسی و بے کسی کو بے حسی میں تبدیل کردیا ہے۔ وہ اپنے حال میں خوش اور مطمئن نظر آتے اور نوجوانوں کو بھی وہی طرز حیات اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں، مگر نئی نسل تو نئی روشنی کی حامی ہے اسے پرانے چراغوں کی روشنی سے کیا مطلب۔ ان کی انہیں خصوصیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے کہ:

''سہیل عظیم آبادی غالباً پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے صوبہ بہار کے دیہات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ بہار کے کسانوں کی دکھ بھری زندگی، سیلاب اور زلزلے کی تباہی اور معاشی استحصال ان کے ابتدائی افسانوں کا محور ہے۔ سہیل کے یہاں پریم چند کی سی سادگی، سکون اور ضبط و

PDF Compressor Free Version

اعتدال ہے۔ وہ زبان سادہ اور تصنع سے پاک لکھتے ہیں اور اس میں دھیمی آنچ دے کر ایک طرح کا گداز اور ہلکا ہلکا درد پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا مختصر سے مختصر افسانہ بھی تاثیر سے لبریز ہے۔ سہیل کے یہاں انقلابی حقیقت نگاری کا رجحان آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ 'الاؤ'، 'پیٹ کی آگ' اور 'دو مزدور' سے لے کر 'رام اور راون' تک انہوں نے ہمیشہ ذہنی ارتقا کا ثبوت دیا ہے۔

سہیل کے افسانوں میں چینی کہانیوں کی سی سادگی اور اختصار اور حقیقت کا بے لاگ مشاہدہ ملتا ہے۔ ماں، بیٹا، بھائی، بیوی مختلف حیثیتوں سے انہوں نے انسانی کردار کا گہرا مطالعہ کیا اور اسے سماجی حقیقتوں سے ٹکرا کر بعض بنیادی مسائل کی طرف اشارے کئے ہیں جو صرف انہیں سے مخصوص ہیں۔ گھریلو زندگی کے بعض چھوٹے چھوٹے مسائل جنہیں عام طور پر افسانہ نگار بے وقعت سمجھ کر اپنی کہانی کا موضوع نہیں بناتے سہیل نے انہیں سے اپنے فن کا جادو جگایا ہے۔''

سادھو اور بیسوا، زندگی کے میدان عمل میں چیتن آنند مہراج اور مایا کے کرداروں کا ذہنی اور عملی تضاد پیش کرتا ہے۔ مایا ایک بیسوا ہے، مگر موہن نے اس گندگی سے نکال کر اپنی شریک حیات بنا کر اسے زینت بخشی۔ دوسری طرف سنیاسی مہراج جو اپنی سحر بیانی سے دوسروں کو متاثر کر کے انہیں مکتی کا راستہ دکھاتے ہیں، پر بچن کرتے ہیں، خود اسی جال میں پھنسے نظر آتے ہیں۔ اس افسانے کا بنیادی مرکز محور یہ اقتباس ہے:

''تپسیا کس نے کی سوامی جی مہراج نے یا اس نے اور تپسیا سے تپ کر مکتی کس کو ملی اسے یا سوامی جی کو؟ اس نے محسوس کیا کہ مکتی اسے ملی ہے۔ مہراج جی تو ابھی بھی انہیں بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں۔''

''اسٹیشن پر'' ان تمام کہانیوں کا مجموعہ ہے جو اس اسٹیشن سے جڑی ہوئی ہیں۔ پرشانت، اس کے دادا، گنگیا، مہرا، بلبیر کس طرح خود کو اس ترقی پذیر معاشرے کے مطابق تبدیل کر رہے ہیں۔ وقت اور حالات میں کس قدر تیزی سے انقلاب آ رہا ہے، مناظر بدل رہے ہیں، فطرت اور قدرت کہیں کھوسی رہی ہے، جنگلات کو کاٹ کر کارخانوں اور آبادی کو آباد کیا جا رہا ہے، نئے نئے شہر وجود میں آ رہے ہیں، تجارت بڑھ رہی ہے، نئی نئی دکانیں لگ رہی ہیں۔ عجائب خاں ہلکا رومانی پر تو لئے ہوئے عجائب خاں کی خوداری، خلوص اور جذبہ ایثار و قربانی سے لبریز ہے۔ اپنے محسن پر قربان ہو کر انہیں کسی بھی طرح کی پریشانی سے محفوظ رکھنے کا جذبہ ہی اس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔

سہیل عظیم آبادی جنسیات کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہیں جو ہمارے قلب و ذہن کو گدگداتے ہیں۔ ان کے کئی کردار جوانی کی امنگوں اور ترنگوں سے اس قدر لبریز ہوتے ہیں کہ قاری ان سے مسرور اور مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ عورتوں کے دلوں کی دھڑکنوں، ان کے جذبات و احساسات، مرد کے تئیں ان کے تخیلات و تصورات سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی کے افسانہ ''گرم راکھ'' کی روھیا اس کی بہترین مثال ہے جس کی شادی پانچ برس کی عمر میں ہی ہو گئی تھی۔ روھیا کا کردار سہیل عظیم آبادی کے نفسیات نسواں کے قوی مطالعے و مشاہدے کا مظہر ہے۔ روھیا کی جوانی کے دنوں کے تخیلات و خواہشات ہی اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے اپنے سینے سے لگا کر پیار کرے اور اس پیار کی گرمی سے پگھل کر وہ اس کی گود میں پھیل جائے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ کوئی اس کی بوٹی بوٹی دبائے اور ایسے دبائے کہ اس کا بدن دکھنے لگے۔ جب وہ بے چین و بے قرار ہوتی ہے تو سوچتی ہے کہ کوئی اسے بار بار دبوچے اور تب تک دبوچتا رہے جب تک اس کی چیخ نہ نکل جائے۔ اپنے بازوؤں میں کس کر پیار کرے، اسی لئے وہ اپنی نظریں ہر مرد پر ڈالتی ہے اور سوچتی ہے کہ وہ بھی اسے دیکھے، اسی لئے کوئی اسے دیکھتا ہے تو اسے بہت اچھا لگتا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا افسانہ ''دل کانٹا'' بھی بجنی اور امل کے جنسی جذبات پر منحصر ایک رومانی افسانہ ہے۔ امل کا ہاتھ بجنی کے ہاتھ سے چھو جانے پر اس کے جسم میں بجلی کی لہری پیدا ہونا، بجنی کے نرم ہاتھوں کے جادوئی لطف کا احساس، بجنی کا گٹھا ہوا جسم بالخصوص سینے کا ابھار، اس کے

PDF Compressor Free Version

جسم کی پاگل و بے چین کرنے والی خوشبو، اس کے سر سے آنچل کا سرکنا اور لمبے اور گھنے بالوں کا زمین پر بکھرنا، اس کے بلاؤز کے بٹن کا کھلنا اور جوانی کی علامتوں کا نظر آنا وغیرہ ایسے مناظر ہیں جو افسانے کے کرداروں اور قاری کے دلوں کے تار کو چھیڑتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی اپنے افسانوں میں کبھی کبھی فلسفیانہ رُخ بھی اختیار کرتے ہیں۔ وہ زندگی اور اس کے سکھ دُکھ پر ایک فلسفی کی مانند بحث کرتے ہیں۔ انسانوں کو اپنے دکھ درد کو کم کرنے کے لیے دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ''بدصورت لڑکی'' کی چندرا کالی کلوٹی لڑکی ہے جس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔ کئی لڑکے اس کی بدصورتی کا مذاق اڑا چکے ہیں:

''ارے دیکھو' چاند کے ساتھ ساتھ کالی بدلی بھی ہے۔
کالی میا میری پرارتھنا مان لے..... ایسے مت نکلا کر
.....ہم کو ڈر لگتا ہے۔''

گویا صورت ہی سب کچھ ہے۔ سیرت کی کوئی اہمیت نہیں۔ چندرا میں خوبصورتی کی بھلے ہی کمی ہو، مگر خوب سیرتی، پاکیزگی، خوش اخلاقی اور خوش سلیقگی اس کے کردار کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ دوسروں کی خدمت کر کے خوش ہونا، ان کے غموں میں شریک ہونا وہ اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتی ہے۔ افسانے کا ایک بہترین جملہ ہے کہ:

''دنیا بھی کیسی عجیب جگہ ہے۔ صورت کو سب دیکھتے ہیں، دل کو کوئی نہیں دیکھتا۔''

چندرا کی صورت تو ہر کوئی دیکھتا ہے مگر سیرت کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ درج ذیل اقتباس افسانہ نگار کے فلسفیانہ ذہنی رویے کی عکاسی کرتا ہے جس پر بدھ مذہب کا کافی اثر ہے:

''آدمی دکھوں کی گود میں پیدا ہوتا ہے اور جب تک زندہ رہتا ہے، طرح طرح کے دکھ اسے گھیرے رہتے ہیں۔ زندگی نام ہی ہے دکھوں کو جھیلنے اور ان کا مقابلہ کرنے کا اور خوشی ان پلوں اور گھڑیوں کا، جب آدمی ان دکھوں پر قابو پالیتا ہے اور دکھوں کے نیچے سے نکل بھاگتا ہے۔ اس دنیا میں وہ اکیلی دکھی نہیں ہے، ہر آدمی دکھی ہے۔ کسی کو کوئی دکھ ہے اور کسی کو کوئی دکھ۔ دکھوں سے کوئی بچا ہوا نہیں ہے اور ان دکھوں میں سے خوشی کا کچھ وقت نکال لینا ہی انسان کی بڑی کامیابی ہے۔''

چندرا کی ایک سہیلی کسم اس کی خوب سیرتی اور خوش اخلاقی کی بنا پر اپنی موت کے بعد اپنے شوہر سے چندرا سے شادی کرنے کا وعدہ لیتی ہے، مگر ہائے رے چندرا کی بدنصیبی کہ کسم کی موت کے بعد اس کے شوہر نے بھی چندرا کو ''بہن'' کہہ کر مخاطب کیا۔ یہ افسانہ سہیل عظیم آبادی کی انفرادیت کا مظہر ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا اختتام قاری کی مرضی کے مطابق نہ ہو، مگر سماج کی تلخ حقیقت تقریباً ایسی ہی ہے جہاں آجکل صورت کو سیرت پر فوقیت دی جاتی ہے۔

اس طرح اگر سہیل عظیم آبادی کی جملہ تصانیف کا محاکمہ کرتے ہوئے ان کا محاسبہ کیا جائے تو یہ کہنا بالکل غلط نہ ہوگا کہ ان کے افسانوں میں ان کی شخصیت، ان کے افکار و نظریات، ان کے جذبات و خیالات کا نہ صرف عکس ہے بلکہ اس سے قاری کو موثر انداز میں متاثر کرنے کی قوت بھی ہے۔ ایک طرف وہ انقلاب کی باتیں کرتے ہیں تو دوسری طرف رومانی انداز اختیار کرتے ہوئے جنسی نفسیات کا بھی اپنے افسانوں میں کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ ان کے کردار بالکل وہی کردار ہیں جو ہمارے اردگرد ہیں، وہ کہیں سے اٹھا کر لائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان سے سہیل عظیم آبادی بالکل واقف ہیں۔ ❁❁

ضروری اطلاع

زبان و ادب کی خریداری کے لئے آپ زرسالانہ سو روپے براہ راست اردو اکادمی کے اکاؤنٹ میں بھی ڈال سکتے ہیں، لیکن رقم بھیجنے کی جانکاری کے ساتھ ہی اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر اکادمی کو ضرور بھیج دیں۔

Bihar Urdu Academy

Bank of India, Chauhatta, Patna 800004

SB A/c No. 440810100006014

IFSC Code- BKID0004408

PDF Compressor Free Version

افسانے

ایم۔مبین

303, Classic Plaza,Teen Batti, Bhiwandi 421 302
Dist. Thane (Maharashtra) (Mob. 9322338918)

لذت

بھولا کے اسٹال پر اس دن معمول سے زیادہ بھیڑ تھی۔ اسے بھیڑ دیکھ کر کچھ الجھن سی ہوئی۔اس نے اپنے کلائی میں بندھی قیمتی گھڑی دیکھی اور ذہن میں حساب لگانے لگا کہ بھولا سے پاؤ بھاجی لے کر کھانے میں اسے کتنا وقت لگے گا اور اس کے پاس اتنا وقت ہے بھی یا نہیں؟ اگر وہ اتنا وقت یہاں صرف کرے گا تو اسے کسی میٹنگ کے لیے کتنی تاخیر ہوگی اور اس کا کون سا اہم کام چھوٹ جائے گا؟

اس calculation کے بعد تو اس کے ذہن میں ایک ہی جواب ابھرتا تھا۔وہ بھولا کی پاؤ بھاجی کھانے کا خیال ذہن سے نکال دے اور واپس اپنی کار میں جا کر بیٹھ جائے اور جس کام کے لیے وہ نکلا ہے، وہ کام کرنے کے لیے روانہ ہو جائے، لیکن دل نہیں مان رہا تھا۔ بھولا کی پاؤ بھاجی کھائے بہت دن ہو گئے تھے۔زبان شدت سے اس پاؤ بھاجی کی لذت اور چٹخارے کی بھوک محسوس کر رہی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے کئی اہم کام کرنے ضروری ہیں، کئی کام جو زندگی کی ضرورت ہیں، جو جینے کے لیے لازمی ہیں، جو شاید Way of life کے ضروری جزو ہیں۔ان میں سے بھولا کی پاؤ بھاجی کھانا بھی ایک ضروری کام ہے، جس طرح Luxurisc اشیاء کا استعمال Life Style کے لیے ضروری ہے، شاید بھولا کی پاؤ بھاجی کھانا بھی اس کی Life Style کا ایک جزو ہے۔

وہ چپ چاپ لائن میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

پاؤ بھاجی بناتے ہوئے بھولا کی نظر اس پر پڑی۔اس کے بھدے ہونٹوں پر ایک بھدی سی شناسائی بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔اس کے لئے وہ بھی ایک عام گاہک تھا۔ اس کی نظر میں تمام گاہکوں کی اہمیت یکساں تھی، کوئی برتر یا اعلیٰ نہیں تھا، سب اس کے گاہک تھے۔اس نے قطار میں کھڑے لوگوں کا جائزہ لیا۔

قطار میں ہر طرح کے لوگ تھے۔اس کی طرح کچھ پاش کپڑوں والے گاہک بھی تھے اور گندے میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے کچھ معمولی لوگ اور کچھ سلیقے سے لباس تن زیب کیے نوجوان بھی تھے۔ ان نوجوانوں میں وہ اپنا ماضی تلاش کرنے لگا۔اسے ہر نوجوان میں اپنا ماضی دکھائی دے رہا تھا۔یہ سارے نوجوان شاید بے روزگار ہیں۔ روزگار کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک کر کم پیسوں میں اپنی بھوک مٹانے کے لیے بھولا کی گاڑی پر آئے ہیں۔جس طرح کبھی وہ بھی روزی کی تلاش میں در بدر بھٹکنے کے بعد بھوک مٹانے کے لیے بھولا کی گاڑی پر آتا تھا۔

ان میں سے کچھ نوجوان ممکن ہے چھوٹے موٹے جاب کرتے ہوں۔ان کی آمدنی اتنی نہیں ہوگی کہ وہ کھانا کسی متوسط درجے کے ہوٹل میں کھا کر اپنی بھوک مٹائیں۔ پیسے بچانے کے لیے اور بھوک مٹانے کے لیے وہ بھولا کی گاڑی پر آتے ہوں گے، اسی طرح جس طرح وہ چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد بھولا کی گاڑی پر آتا تھا۔

پاش دکھائی دینے والے گاہک شاید اس کے زمرے کے تھے۔یہ لوگ اونچے عہدوں پر ہیں یا ان کا اپنا اچھا کاروبار ہے۔یہ اپنی بھوک فائیو اسٹار ہوٹلوں کے بجائے کانٹینٹل کھانوں سے بھی مٹانے کی استطاعت رکھتے ہیں، لیکن بھولا کی پاؤ بھاجی کی لذت اسی طرح انھیں بھی بھولا کی گاڑی تک کھینچ لاتی ہے، جس طرح اس کو کھینچ لاتی ہے۔

وہ اس وقت چار پانچ چھوٹی بڑی کمپنیوں کا مالک تھا۔ اس کے پاس کتنی دولت ہے خود اسے اندازہ نہیں تھا۔اس کی کمپنیوں میں کام کرنے والے ہزاروں نوکر ہوں گے۔روزانہ اس کے ذہن میں ایک نئے بزنس کا خیال آتا تھا اور پھر وہ اور اس کا عملہ اس خیال کو

PDF Compressor Free Version

حقیقت میں تبدیل کرنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔

اس کا ایک ایک لمحہ اس کے لیے قیمتی ہیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر لمحہ اس کے لیے دولت کا ایک ریلہ لے کر آتا تھا۔ اس کا بزنس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ کاروبار کی دنیا میں اس کی ساکھ تو کبھی کی بن چکی تھی، اس کا نام اور اس کے برانڈ کو احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

روزانہ شیئر مارکیٹ میں اس کی قائم کردہ کمپنیوں کے نرخ میں ہونے والی تبدیلیاں اس کی دولت میں بے انتہا اضافہ کر دیتیں پھر معمولی سی کمی کر دیتی تھیں۔ اس نے اپنے اس مرتبہ کو پانے کا خواب ضرور دیکھا تھا، لیکن اسے اس کے سارے خوابوں کی تعبیر مل جائے گی، اس بات کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

پندرہ سال قبل وہ اس شہر میں روزگار کی تلاش میں آیا تھا اور اسے اس شہر میں ابتدا میں وہی ملا تھا جو ایک بے روزگار تعلیم یافتہ اور قابل نوجوان کو ملتا ہے۔ دھکے، مایوسیاں، بے بسی اور لاچاری، بھوک، ناامیدی سب کچھ اس کی جھولی میں آ گرے تھے، جن کا بوجھ اٹھانے کی اس میں سکت نہیں بچی تھی، لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اسے یقین تھا کہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر وہ اس شہر میں ایک اچھی زندگی گزارنے کے قابل وسائل تو مہیا کر ہی لے گا۔

اُس وقت بھولا کی گاڑی اس کا بہت بڑا سہارا تھی۔

بھولا اُس وقت بھی پاؤ بھاجی بیچتا تھا اور آج بھی۔ اس کی گاڑی اور اس کی گاڑی کے محل وقوع میں آج بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ پہلے وہ جگہ کافی حد تک ویران تھی، اب اس جگہ کے اطراف میں Sky lark ٹائپ کی بلڈنگیں کھڑی ہو گئی ہیں اور وہ پورا علاقہ ایک بڑا بزنس زون بن گیا ہے، جس کی وجہ سے بھولا کے دھندے میں بھی بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔ پہلے بھولا کم مقدار میں پاؤ بھاجی بناتا تھا، جس کو کھانے کے لیے چند ہ لوگ آتے تھے۔ وہ انھیں بڑے خلوص سے پاؤ بھاجی پروستا تھا اور گھنٹوں ان سے گپ شپ کر کے اپنی زندگی کے حالات سناتا تھا اور ان کی زندگی کے حالات سنتا تھا۔ اس کے سارے گاہکوں سے ایک فیملی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ضرورتمندوں کو مہینوں تک ادھار یا مفت میں پاؤ بھاجی کھلانا بھی اس کے اچھے کاموں میں سے ایک کام تھا۔ اپنی جدوجہد کے زمانے میں کئی بار اسے بھی بھولا نے مفت میں پاؤ بھاجی کھلائی تھی اور ادھار تو چلتا رہتا تھا۔ وہ جب بھی کوئی ترقی حاصل کرتا، سب سے پہلے اس کی خوش خبری بھولا کو ضرور سناتا تھا۔

''پرکاش بابو! میں نے اس شہر میں بہت سے لوگوں کو زمین سے اٹھ کر آسمان میں پہنچتے دیکھا ہے، جو لوگ محنت پر یقین رکھتے ہیں اور قابل ہوتے ہیں انھیں آسمان تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی ہے۔ تم بھی ایک دن ضرور آسمان کی بلندی کو چھوؤ گے، میرا دل کہتا ہے۔ جو لوگ بڑے بن جاتے ہیں وہ بھولا کی گاڑی کو بھول جاتے ہیں۔ تم بھی شاید بڑے بن کر بھولا اور بھولا کی پاؤ بھاجی کو بھول جاؤ۔''

''نہیں بھولا.....!.....ایسی بات نہیں ہے۔ میں تمہارے پاؤ بھاجی کی لذت شاید ہی بھول پاؤں۔ یہ لذت مجھے کھینچ کر تمہارے پاس لاتی رہے گی، چاہے میں دنیا کے کسی بھی کونے میں پہنچ جاؤں۔''

اور سچ مچ وہ اس لذت کا اسیر بن کر رہ گیا تھا۔

اسے کسی دوسرے شہر جانے کی ضرورت تو پیش نہیں آ سکی۔ اسی شہر میں وہ ترقی کے زینے طے کرتا رہا۔ بھولا سے اس کا رشتہ ٹوٹ نہیں سکا تھا۔ وہ بار بار بھولا کی گاڑی پر آتا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اب وہ گھنٹوں بھولا کے ساتھ نہیں گزار پاتا تھا، نہ زیادہ باتیں کر پاتا تھا۔ وہ بھولا کے پاؤ بھاجی کی لذت میں بھولا کے پاس آتا اور پاؤ بھاجی کھا کر چل دیتا۔

اب بھولا کے پاس بھی اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ گاہکوں سے ان کے حال واحوال پوچھ سکے۔ اس کا بھی دھندہ بڑھتا گیا تھا۔ اس کی جسمانی ساخت اور لباس، طور طریقوں میں تو کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی دس پندرہ سال پرانا بھولا ہی دکھائی دیتا تھا، لیکن سنا تھا اس نے وطن میں اچھی خاصی جائیداد بنائی ہے۔ وہ کئی کھیتوں کا مالک ہے اور گاؤں میں اس کا بنگلہ نما گھر ہے۔

قطار دھیرے دھیرے سرک رہی تھی اور وہ اپنے نمبر کے آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا اس کا V.I.P. سے بڑھ کر خیال رکھا جاتا تھا۔ کسی بھی بڑی سے بڑی تقریب اس کے آنے سے پہلے شروع نہیں ہوتی تھی، لیکن بھولا کی گاڑی پر اسے قطار میں کھڑے ہو کر انتظار کرنا پڑتا تھا اور اسے یہ گوارہ تھا۔ وہ یہاں پر بھولا سے

PDF Compressor Free Version

اپنے لیے کوئی V.I.P. Treatment نہیں چاہتا تھا۔ اسے اس گاڑی پر پاؤ بھاجی خریدنے کے لیے قطار لگانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی وہ سوچتا تھا کہ بھولا کی پاؤ بھاجی وہ آفس میں منگوا کر کھائے یا پھر کار میں بیٹھے بیٹھے ڈرائیور سے پاؤ بھاجی منگوا کر کھائے، لیکن پھر وہ سوچتا جب لوگوں کو پتہ چلے گا کہ اس جیسا کروڑ پتی آدمی ایک گندی پاؤ بھاجی کی گاڑی سے پاؤ بھاجی منگوا کر کھاتا ہے تو اس کے آفس میں کام کرنے والے یا اس کا ڈرائیور اس کے بارے میں کیا سوچے گا؟

وہ اپنا Status ان کی نظروں میں خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس علاقے میں پہنچ کر ڈرائیور کو کسی مقام پر کار کھڑی کرنے کے لئے کہہ دیتا تھا اور پیدل چل کر بھولا کی گاڑی تک آتا تھا۔ ڈرائیور کو یہ پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں گیا ہے؟ کس کام کے لیے گیا ہے؟

اپنی تشنگی مٹا کر وہ واپس کار میں آکر بیٹھ جاتا اور اپنے کام کے لئے چل دیتا۔ کبھی کبھی اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ مہینوں تک بھولا کی گاڑی تک نہیں جا پاتا تھا۔ اس وقت اس کی حالت کسی عادی نشہ باز کی طرح ہوتی تھی، لیکن اتنا بڑا آدمی بن جانے کے بعد وہ ان باتوں کو برداشت کرنا سیکھ گیا تھا، اس کے لیے یہ لذت یہ نشہ گویا اس کی زندگی کا ایک جزو تھا۔

اس کے آگے کوئی مزدور کھڑا تھا۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی پسینے کی بدبو سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا، لیکن وہ اسے برداشت کیے جا رہا تھا۔ ایک بار تو وہ بدبو اتنی ناقابلِ برداشت ہوگئی کہ دل میں آیا وہ قطار سے نکل جائے اور اس لذت کو بھول جائے، مگر اتنا وقت گزارنے کے بعد وہ خود کو یہ فیصلہ لینے کے قابل نہیں پا رہا تھا۔

آخر اس کا نمبر آگیا۔

بھولا نے مسکرا کر پاؤ بھاجی کی پلیٹ اس کی طرف بڑھادی اور اس نے بھولا کی طرف پیسے۔ اس سے زیادہ دونوں کے درمیان کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ پلیٹ اٹھا کر ایک طرف کھڑا ہو کر کھانے لگا۔ زبان اس آشنا سی لذت سے آشنا ہونے لگی اور اسے محسوس ہونے لگا جیسے اس کی روح میں ایک تازگی سی بھرتی جا رہی ہے۔

''ارے پرکاش جی آپ.....! آپ یہاں اس گندی سی گاڑی پر کھڑے ہو کر پاؤ بھاجی کھا رہے ہیں؟''

ایک آواز سن کر وہ چونکا۔ سامنے داور کھڑا تھا۔ داور بھی اس کی طرح ایک بہت بڑا بزنس مین تھا۔

''اگر زیادہ ہی بھوک لگی تھی تو قریب ایک فائیو اسٹار ہوٹل بھی تھا، وہاں جا کر کھانا کھا لیتے۔''

''نہیں، داور صاحب! ایسی بات نہیں'' وہ جھینپے ہوئے انداز میں بولا:

''اصل میں اس گاڑی کی پاؤ بھاجی بہت لذیذ ہوتی ہے۔ میں عرصے سے یہ کھاتا ہوں اور اسی لذت کو حاصل کرنے کے لیے اس گاڑی پر یہ پاؤ بھاجی کھانے آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے پرکاش صاحب! اگر آپ کو اس گاڑی کی پاؤ بھاجی اتنی پسند ہے تو اچھی بات ہے، لیکن کم سے کم اپنی Status کا تو خیال رکھیے۔ آپ چاہیں تو اس گاڑی والے کو اپنے گھر بلا کر اس کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی پاؤ بھاجی کھا کر اس لذت کو حاصل کر سکتے ہیں، لیکن آپ کا یہاں اس طرح کھانا کچھ Cheap لگتا ہے۔''

اسے محسوس ہوا داور نے جیسے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہے۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے گرد ہزاروں آنکھوں نے گھیرا ڈال دیا ہے۔ یہ ساری آنکھیں اس کے شناسا لوگوں کی آنکھیں ہیں۔ سب جیسے کہہ رہے ہیں:

''یہ سب کتنا Cheap ہے؟''

''آپ اس گاڑی والے کو اپنے گھر بلا کر اس سے پاؤ بھاجی بنا کر بھی کھا سکتے ہیں۔''

''آپ کے پاس اتنا پیسہ ہے..... کس کام کا..؟''

پاؤ بھاجی کے نوالے اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہے تھے۔

اس نے آدھی پلیٹ ہی کھائی۔ باقی بچا ہوا کھانا جھوٹے برتنوں میں ڈال دیا اور وہاں سے تیزی سے اپنی کار کی طرف چل دیا۔

بھلے ہی وہ ٹھیک سے بھولا کی پاؤ بھاجی نہیں کھا سکا تھا، لیکن اسے ایک نئی راہ مل گئی تھی۔ ایک ایسا راستہ جس کے بارے میں اس نے

PDF Compressor Free Version

ابھی تک نہیں سوچا تھا۔ وہ بھولا کو اپنے بنگلے پر بلا کر اس کے ہاتھوں سے پاؤ بھاجی بنا کر بھی کھا سکتا ہے، اب اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

وہ مطمئن سا تھا۔ اس نے دو دن بعد ہی بھولا سے اپنے گھر میں پاؤ بھاجی بنا کر کھانے کا منصوبہ بنا دیا۔ اس نے اپنے سکریٹری کو سب سمجھا دیا کہ بھولا کون ہے؟ اس کی گاڑی کہاں لگتی ہے؟ اسے اس بات کے لئے تیار کرنا ہے کہ اسے میرے گھر آ کر پاؤ بھاجی بنانی ہے، اس کے لئے وہ اس کام کی جو بھی قیمت مانگے، دے دینا۔

سکریٹری نے شام میں ہی جا کر بھولا سے ساری باتیں طے کر لیں۔ ایک بڑی رقم کے عوض بھولا اس کے گھر آ کر پاؤ بھاجی بنانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا، بھولا کی پاؤ بھاجی کی لذت سے اپنے چنندہ احباب کو بھی متعارف کرایا جائے، اس لئے اس نے انھیں بھی دوپہر میں پاؤ بھاجی کھانے کی دعوت دے دی۔

بھولا دوسرے دن سویرے ہی اس کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا۔

''ارے پرکاش بابو! ایں آپ کا بنگلہ ہے۔ ہم آپ کے لئے پاؤ بھاجی بنانے آئے ہیں۔ ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کون پرکاش مہتانی ہے، اس لیے یہاں آ کر کام کرنے کی قیمت بتا دی۔ اب ہم پیسہ نہیں لیں گے۔ آپ سے پیسہ لیں..... رام..... رام..... رام! ارے ایں تو ہمارا سمان ہے۔ ہم اتنے بڑے آدمی کو اپنے ہاتھوں سے پاؤ بھاجی بنا کر کھلا رہے ہیں۔ ہم نے تو سپنے میں بھی کلپنا نہیں کی تھی کہ تم ایک دن اتنے بڑے آدمی بن جاؤ گے۔''

بھولا سے سکریٹری نے ضروری سامان کی فہرست مانگی اور پھر اس کی فہرست کے مطابق اعلیٰ درجہ کا سامان منگوا کر بھولا کے حوالے کر دیا گیا اور بھولا اپنی تیاری میں لگ گیا۔

وہ دوپہر تک آفس میں کام کرتا رہا، لیکن اس کا دل پاؤ بھاجی میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ اس درمیان اس نے اپنے کئی شناساؤں کو جنہیں اس نے پاؤ بھاجی کھانے کی دعوت دی تھی، پاؤ بھاجی کی لذت کے قصے سنائے تھے اور وقت پر پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تمام مہمان وقت پر پہنچ گئے۔ اس کے بنگلے سے بڑے سے ڈرائنگ روم کے بڑے سے ڈائننگ ٹیبل پر سب بیٹھ گئے۔ کمرے میں ایئر کنڈیشن چل رہا تھا۔ نوکروں نے بڑی نفاست سے قیمتی برتنوں میں مہمانوں کے سامنے بھولا کی بنائی ہوئی پاؤ بھاجی پروسی۔

مہمانوں کے ساتھ اس نے بھی پاؤ بھاجی کھانی شروع کی۔ جو بھی کھاتا، پہلے لقمے کے ساتھ ہی اس کے منہ سے تعریفوں کے پل بندھنے لگتے۔ ہر کوئی پاؤ بھاجی اور اس دعوت کی تعریف کر رہا تھا۔ یہ سن کر اس کا دل خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا، لیکن پھر بھی اس کے دل میں ایک چور تھا۔ اسے اس پاؤ بھاجی سے وہ لذت حاصل نہیں ہو رہی تھی جس کا وہ اسیر تھا اور جس کی دیوانگی اسے بار بار اپنے رتبہ کی پرواہ کیے بنا بھولا کی گاڑی تک لے جاتی تھی۔

ہر لقمہ میں وہ اس لذت اور ذائقے کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا، لیکن اسے بھولا کی گاڑی کی پاؤ بھاجی کی لذت نہیں مل پا رہی تھی جس سے اس کی تشنگی بجھ جائے۔ اس کی تشنگی بجھ نہیں سکی بلکہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ سارے مہمان اس کی پاؤ بھاجی کی تعریف کر کے دعوت کے لیے اس کا شکریہ ادا کر کے واپس چلے گئے۔

''کہو پرکاش بابو! کیسی لگی ہماری پاؤ بھاجی.....؟''

بھولا نے اس سے پوچھا۔

''بھولا! مہمانوں کو تو تمہاری پاؤ بھاجی بہت پسند آئی۔ سب تمہاری پاؤ بھاجی کی تعریف کر رہے تھے مگر.....''

''مگر کا بابو.....؟''

''بھولا! مجھے اس پاؤ بھاجی میں وہ لذت نہیں ملی جو تمھاری گاڑی کی پاؤ بھاجی میں ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔

اس کی یہ بات سن کر بھولا ہنس پڑا۔

''بابو! یہاں پر گاڑی کی لذت آ بھی نہیں سکتی۔''

''مگر کیوں.....؟ گاڑی کی پاؤ بھاجی بھی تم بناتے تھے اور یہاں بھی تم نے بنائی ہے۔''

''بابو جی! یہ پاؤ بھاجی ایئر کنڈیشن کچن میں بنائی گئی ہے اور ایئر کنڈیشن ڈائننگ ہال میں کھائی گئی ہے۔ بھلا یہاں پر کھلی ہوا میں سورج کی گرمی میں پسینے کی بو کے درمیان بنائی اور کھائی جانے والی پاؤ بھاجی کی لذت کہاں سے مل سکتی ہے۔'' ❁❁

PDF Compressor Free Version

محمد ہاشم خان

103/Jasmine Apartment, Green Park Complex, Shil, Thane 410203 (M.S.)

سرو جنی

''گیہوں کی بالیاں کچھ زیادہ بڑی ہونے لگی ہیں۔''

''ہاں اور پگڈنڈیاں اب سکڑ گئی ہیں۔ دو لوگ ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔'' کوئی ایک مانوس سی آواز نے سرگوشی کی، اس نے آس پاس دیکھا۔ ادھ پکی بالیوں کے لہلہانے کی آواز تھی، کچھ دن قبل سرپھری ہوا چلی، ابر و باراں میں زبر اور گھنی فصلیں چت لیٹ گئیں، حالاں کہ کسان راحت کی سانس لے رہے تھے کہ پروا چل رہی ہے، گیہوں کے دانے اب سوکھے اور پتلے نہیں ہوں گے۔ وہ آٹھ سال اور پانچ مہینے میں دوسری بار گاؤں آیا تھا، گاؤں جو پہلے جیسا نہیں تھا۔ یہ وہ گاؤں تو بالکل نہیں لگ رہا تھا جس کی بل کھاتی گلیاں بچپن کی شوخیوں، آرزوؤں اور محرومیوں کی گواہ تھیں۔ بڑے پیڑ ایک ایک کر کے سوکھ رہے تھے اور جو سرسبز تھے وہ بے ثمر تھے۔ نکڑ بھی غیر آباد تھے، افتادگان، خاک بیڑی اپنے گھروں میں سلگاتے تھے، دھواں کہیں اور چھوڑتے تھے اور بھی بہت کچھ بدل چکا تھا، سکھی سہیلیوں میں بھیجا چوبھا، لولا لپسی، چوکھا، چٹنی اور سالن کا تبادلہ تقریباً معدوم ہو چکا تھا، گھٹ گھٹی کم ہو رہی تھی، سب کو اپنا اپنا اسپیس چاہئے تھا، اسپیس سکڑ رہا تھا۔

وہ دالان میں بیٹھا بے چینی کا پیرہن اوڑھے بور ہو گیا تھا، باپ کے آنے میں وقت تھا، چھوٹی امی اپنے معمول کے کام میں مصروف تھیں، ان کے یہاں اشرف کا وجود نہیں تھا۔ وہ کویتا کاکی کے گھر پر گیا، جو سڑک پار اناجوں کے لئے تعمیر شدہ کوٹھریوں کے ساتھ واقع تھا، مگر دروازے پر تالا لگا ہوا تھا، سو وہ کھیت کی اور نکل گیا۔ کھیت جس نے اسے کبھی گاؤں کے دیگر بچوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع نہیں دیا۔ کھیت، دور تک پھیلا ہوا ادھیڑ عمر کی اوبڑ کھابڑ عورت کی طرح ناہموار اور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کے غیر مسطح بدن پر چھوٹے چھوٹے پستان نما چند میدانی ٹیلے گویا آسمان نے میخ ٹھونک دیا ہے اور وہیں پر واقع ایک خاموش و ملول تالاب جو کئی غیر مرئی مقدس گناہوں کی تعمیل و تکمیل اور تطہیر و تدفین کا مبہم استعارہ تھا۔ وہ وہیں پر کھڑا چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔ چہار جانب دور دور تک صرف گندم کی فصلیں تھیں اور کہیں کہیں ایک دو کھیت میں ارہر کی بوائی ہوئی تھی۔ پوری فضا پر گیہواں رنگ چھایا ہوا تھا اور ارہر کے چھوٹے چھوٹے سبز پتوں کی موجودگی یوں معلوم ہو رہی تھی جیسے فلک نے زمین کے اس گیہواں بدن پر ہری اوڑھنی اچھال دی ہے۔ گیہواں بدن جس کی کشش کا اسے پہلے کوئی ادراک نہیں تھا، جس کے نشیب و فراز جسم کے کسی حصے میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں کر رہے تھے، اب اسے خیال آتا ہے کہ شاید وہ بدن نہیں تھا، جمالیات کا سرچشمہ تھا۔ وہ ارہر کی طرف مڑنے والی گزرگاہ پر چل پڑا، یادوں کی راہ گزر پر لمحوں کی بانسری بجاتا ہوا۔

''اکیلے جا رہے ہو؟ پگڈنڈیاں سکڑ گئی ہیں؟ دو لوگ ایک ساتھ نہیں چل سکتے؟'' خلا سے کوئی صندلی آواز آئی، یہ آواز نہیں تھی، بے بسی کا استعارہ تھا، یہ شکایت نہیں ایک طنز تھا، زیست کے گوشوارے پر فسردہ کن، مضمحل، مضطرب، جاں سوز۔ دو چار گام آگے بڑھا، وہ محسوس کر رہا تھا کہ ہر گام کے ساتھ آہٹ تیز ہوتی جا رہی ہے، پگڈنڈی کے دونوں طرف خودرو گھاس پابہ زنجیر ہو گئی ہے۔ اسے خیال آیا، سردیوں کے موسم میں گھاس پر جمی شبنم کی چھتوں کے چھینٹے اڑاتے ہوئے ننگے پاؤں دور چلے جایا کرتے تھے۔ اب گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ماں کی کوئی شبیہ اس کے ذہن میں نہیں تھی، باپ نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ کوئی پری لے کر آ رہی تھی کہ عزازیل نے دھکا مار دیا۔ سوتیلی ماں تھی جو اپنی دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ساتھ دن بہ دن جوان ہو رہی تھی اور باپ تھا جس پر

PDF Compressor Free Version

مرض، نقاہت اور پیری کا پیرہن دن بہ دن دبیز ہوتا جارہا تھا۔

سورج کے اطراف شفق کا حصار بڑھتا جارہا تھا۔ اس نے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے چاروں طرف نظر دوڑائی، سامنے سڑک کے اس پار کوتا کا کی کا گھر تھا، برآمدے میں کوئی روشنی نہیں تھی، اسے یاد آیا کہ وہاں سرشام ایک لالٹین لٹکا کرتی تھی۔ دھیمی دھیمی زرد روشنی میں ایک سایہ دھیمے دھیمے آگے پیچھے گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ ایک ایک پل، گاہ بہت ہی مسرت آگیں اور گاہ بہت ہی اذیت ناک گزر رہا تھا۔ وہ اپنے گھر سے نکل آیا اور وہاں برآمدے میں جاکر ایک ادھ بنی بوسیدہ کھٹیا پر بیٹھ گیا۔ جہاں سرشام لالٹین جلا کرتی تھی اور.....اور کوئی لالٹین جلایا کرتی تھی اور اسی روشنی میں دو لوگ اپنا اپنا ہوم ورک کررہے ہوتے تھے۔

''تو نے کچھ سنا ہے؟ مائی بول رہی تھی کہ امتحان کے بعد ہم لوگ شہر چلے جائیں گے۔'' اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''مائی بول رہی تھی کہ اب ہم شہر میں ہی رہیں گے۔''

اس نے دیکھا کہ لالٹین کی روشنی میں اس کا گندمی، بیضوی چہرہ کچھ اور دمک رہا ہے۔ شہر جانے کی خوشی میں؟ کیا وہ بھی شہر جانا چاہتی ہے؟

''سنا ہے شہر بہت بڑا ہوتا ہے، وہاں بہت بڑے بڑے میلے لگتے ہیں، تو میلے میں گم ہوگئی تو؟'' یہ سنتے ہی اسے جھرجھری آگئی، کیونکہ وہ ایک بار گاؤں کے میلے میں غائب ہوچکی تھی اور پہلی بار اشرف کو خوب مار پڑی تھی۔

''میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا، لے چلے گی نا؟''

دونوں کے ہاتھ ورق میں الجھ گئے۔ کاغذ کے سرے مڑنے لگے، مدھم آواز پیدا کرتے ہوئے آہستہ آہستہ جیسے ایک دوسرے کا خیال موڑ رہے ہوں، ایک دریا چڑھ رہا تھا، ایک ندی اتر رہی تھی، پہلی بار کچھ الگ احساس ہوا۔ اس نے محسوس کیا، سروجنی کے بدن سے کوئی خوشبو پھوٹ رہی ہے اور اس کے انگ انگ میں پھیل رہی ہے۔

دوسرے دن جب وہ دونوں سہ پہر کے خاتمے کے وقت اسکول سے واپس آرہے تھے تو ارہر کے کھیت کے پاس پل بھر کے لئے رکے۔ یہ ان کا معمول تھا، گاؤں اور اسکول کے درمیان ایک پڑاؤ تھا، ستانے کا، تازہ دم ہونے کا، بدمعاش بچوں اور ماسٹروں کو برا بھلا کہنے کا۔

''چل تالاب پر چلتے ہیں، بہت مہوا گرا ہوا ہے۔''

وہ سروجنی کا ہاتھ پکڑ کر ارہر کے کھیت کے اس پار جانے لگا، جہاں کھیتوں کی آبپاشی کے لئے کئی ایکڑ پر محیط ایک اوسط سائز کا تالاب واقع تھا۔ بند ھ کے اوپر ایک مخصوص فاصلے پر شیشم، جامن، بیری اور مہوا کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ بڑے بابو کبھی کبھار آتے تھے۔ اس وقت تالاب تین چوتھائی بھرا ہوا تھا، خودرو آبی پودوں، جل کمبیوں اور کنول نے پانی کی سطح کو مدور شکل میں ڈھانپ لیا تھا۔ چھوٹے بچے ادھر نہیں جاتے تھے، اس نے سن رکھا تھا کہ اس میں مگرمچھ بھی رہتے ہیں۔ سروجنی کچھ دور اس کے ساتھ طوعاً و کرہاً گئی اور جب تالاب پر نظر پڑی تو یوں محسوس ہوا گویا تالاب نہیں، مگرمچھ اپنا جبڑا کھولے ہوئے اس کی آمد کا انتظار کررہا ہے۔ وہ ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگ آئی اور گھر کی طرف سرپٹ دوڑنے لگی۔

''تالاب پر نہیں گئے تھے؟ تالاب! یاد ہے تم نے مجھے ڈوبنے سے بچایا تھا؟'' خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا، یادوں کے آباد خرابے سے لوٹ آیا۔ امتحان ختم ہوتے ہی خلیق احمد اسے شہر چھوڑ آئے۔

''یہ شہر ہے، یہ جب اپنے شہریوں کو خود میں ضم کرتا ہے تو ہضم کرلیتا ہے، ڈکار تک نہیں لیتا، محنت سے پڑھو اور کوشش کرو کہ اس شہر کی خوراک نہ بنو۔''

وہ مبہوت کھڑا اپنے باپ کی شکل دیکھ رہا تھا۔ سپاٹ، کرخت، کھردرا، لاتعلق، اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اس کے باپ نے اچانک اسے شہر کیوں بھیجا تھا۔ شہر تو سروجنی کو جانا تھا۔ ماموں کے پاس، ہمیشہ ہمیش کے لئے۔ شروع کے چار سال خلیق احمد نے خیر خبر لی اور پھر اسے وقت کے آتشدان کے حوالے کردیا۔ اب وہ راکھ ہوجائے یا کندن اس کے جینے کی آرزو پر منحصر ہے، خاک یا کیمیا ہونا اس کی جہد مسلسل کا ماحصل ہے۔

خلیق احمد خان قرب و جوار کے سب سے بڑے مہتو تھے، طویل قامت، وجیہ اور تعلیم یافتہ۔ یہ گاؤں ان کے آباواجداد کا بسایا ہوا تھا، یوں تو ضرورت پڑنے پر مزدوروں کی کمی نہیں تھی، لیکن ایک وفادار ہرواہ رکھنے کی خاندانی روایت تھی۔ دلارے خاندانی ہرواہوں کی آخری کڑی تھا، قد کاٹھ اور شکل وشباہت میں ان سے کچھ ملتا جلتا تھا۔ دلارے کو ان کے والد نے چار کمروں پر مشتمل ایک کوٹھری بنوا کر دی تھی۔ کویتا جب بیاہ کر آئی تو دیکھنے والوں کی آنکھیں نکل پڑیں۔ کسی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ

PDF Compressor Free Version

ایک چمائن بھی زہرہ جبین ہوسکتی ہے۔ایک گڑیت بھی لال عذار ہوسکتی ہے۔

سروجنی کوئی چار سال کی رہی ہوگی۔ دلارے کھیت میں دھان کی فصل کٹوا رہا تھا کہ اسے ایک ناگ نے ڈس لیا اور وہ بھگوان کو پیارا ہوگیا، کویتا کی دنیا ختم ہوگئی، جوانی میں بیوہ ہونے سے زیادہ سنگین جرم اور کیا ہوسکتا تھا۔اسے یہ خوف بھی لاحق تھا کہ اگر بڑے بابو نے گھر خالی کروالیا تو کیا ہوگا۔وہ یہ جانتی تھی کہ خلیق صاحب دن بہ دن، چھوٹی بیگم کے بس میں ہوتے جارہے ہیں۔خلیق صاحب یہ بات جانتے تھے کہ انہوں نے کئی دنوں سے کویتا کی خبر نہیں لی ہے اور کویتا دلارے کی فوتیدگی شدت سے محسوس کرنے لگی ہے۔رات کے کسی پہر وہ کویتا کی خبر لینے گئے اور ایک لمبا دلاسا دے کر آگئے۔سب کچھ نارمل ہوگیا۔وقت، حالات، موسم اور ان سے وابستہ خوشگوار نزاکتیں۔

برآمدے میں رفتگاں کے پری خانے میں ایک اور گھنگھرو بجا، وہ چار سال پیچھے لوٹ گیا، جب بارہویں کا امتحان نمایاں نمبرات سے پاس ہونے کی خوش خبری دینے کے لئے آیا تھا۔سروجنی ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی، سروجنی رگ رگ میں تھی، نس نس میں تھی، کہیں خیال و خواب کے مانند اور کبھی سراب و واہمے کی صورت، یہ آہو لہو میں ناچ رہی تھی۔سروجنی! کون تھی؟ ایک چمائن کی بیٹی؟ دلارے کی دلاری؟ ایک عشق زادے کی بانسری؟ ایک گڑیت کی آفت جاں یا خان صاحبوں کی ملفوف محبت کا مظہر؟ سروجنی ایک راز تھی، یخ بستہ و سربستہ، سروجنی چھ اشعار کی ایک غزل تھی، تہہ دار و طرح دار۔

اشرف کی اچانک آمد خلیق صاحب کو پسند نہیں آئی۔سوتیلی ماں سے تعلقات بس رسمی سے تھے۔کاکی کے گھر ماں بیٹی نے استقبال کیا، کاکی قدموں میں بچھی جارہی تھی، بیٹی سگیان ہوچکی تھی، کچھ محتاط، محجوب اور شرمیلی۔دوپٹے نے دونوں شعلہ فشاں، بالیوں کو قاعدے سے ڈھانپ رکھا تھا، یہ حسن اور جوانی دونوں کا تقاضا تھا، چار برسوں کا گوشوارہ پیش کیا، شہر کی زندگی کے حالات، بے حس، بے روح، خالص مشینی، اپنے مشاہدات، مساعی اور محرومیاں۔کویتا ہمہ تن گوش تھی گویا وہ کوئی کویتا سن رہی ہے۔

''بابو تیں کتنا سندر ہوئے گے ہس، کتنا بڑھیا بولت ہے۔''

(بابو تو کتنا سندر ہوگیا ہے، کتنا بڑھیا بولتا ہے۔) اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے رگ رگ میں دوڑنے والی آہو باہر نکل پڑے۔

''چل باہر چلتے ہیں، تالاب کی طرف'' اس نے سروجنی کو مخاطب کرتے ہوئے کاکی کی طرف دیکھا۔کویتا کچھ سمجھ نہیں پائی کہ وہ اجازت لے رہا تھا یا مطلع کررہا تھا، وہ عجیب کشمکش میں پڑگئی، ہاں ناں کہتے ہوئے کچھ بن نہیں پڑ رہا تھا۔سروجنی اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ اشرف نے واپس کہا: ''کاکی ہم لوگ بس گئے اور آئے'' کویتا نے قدرے ٹھہر کر کہا: ''اب تم لوگ بچے نہیں رہ گئے۔'' اس نے بین السطور پڑھ لیا اس لئے ماحول کو بوجھل ہونے سے بچانے کے لئے مذاقاً کہا:

''کاکی تالاب کی طرف بچے نہیں جاتے۔''

وہ دونوں گھر سے تالاب کی طرف نکل پڑے، اب قدموں میں بے خودی نہیں تھی، ایک ٹھہراؤ تھا، فضا خاموش اور بوجھل تھی۔ پگڈنڈی قدم بہ قدم سکڑ رہی تھی۔ بالآخر وہ کھیت آگیا جس نے ان گنت پڑاؤ دیکھے تھے اور وہ گزرگاہ بھی جو ایک رمیدہ آہو کے پلٹنے کے انتظار میں تھی۔تالاب کی اور لے جانے والی گزرگاہ پر قدم رکھتے ہی پہلی بار سروجنی شکایتی لہجے میں گویا ہوئی: ''پگڈنڈیاں سکڑتی جارہی ہیں، دو لوگ ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔''

وہ کھیت میں اتر گئی۔دونوں ایک بوڑھے شیشم کے پیڑ کے نیچے دوب پر بیٹھ گئے، کھڑی دوپہریا، بیٹھنے والی تھی، پوروا چل رہی تھی، مسام سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔تالاب تقریباً سوکھ چکا تھا، کنول غائب ہوگئے تھے، جل کمیاں دھوپ کی شدت سے جل بجھ رہی تھیں ساتھ ہی اشرف کا دل بھی۔اس کا سکوت، جھجک اور درون خانہ کشمکش سروجنی کو عجیب مخمصے میں ڈالے ہوئے تھے، وہ یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے تغار چے میں پڑی مٹی کوزہ گر کے انتظار میں سوکھ رہی ہے۔کوزہ گر نے خیال کو لفظوں کے پیکر میں ڈھالنا شروع کیا:

''تجھ سے اب اور دور نہیں رہا جاتا، مجھے نہیں معلوم تو کیا سوچتی ہے، لیکن میں ہر پل تجھے ہی سوچتا ہوں۔'' سروجنی کی غزال سی آنکھوں میں گرم وحشت لو دینے لگی، ایک قطرے نے صدیوں کی داستان بیان کردی: ''مجھے ہر چیز میں تمہاری عادت پڑگئی ہے۔''

''میں تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

PDF Compressor Free Version

''میں ایک چمائن کی بیٹی ہوں۔''

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''بڑے بابو کو پڑتا ہے۔''

''بڑے بابو نے تم لوگوں کو کبھی چمار نہیں سمجھا۔''

''یہی تو دکھ ہے کہ ہمیں چمار نہیں سمجھا گیا۔''

''اس گاؤں کے دکھن ٹولے میں ایک پوری چمروٹی ہے، لیکن یہ اختیار کسی اور کو نہیں ملا۔''

''اور وہ چمروٹی ہمیں اپنا نہیں سمجھتی۔''

اشرف بات بڑھانا نہیں چاہ رہا تھا، سو اس نے رخ موڑ دیا۔ ''تجھے مجھ سے زیادہ کوئی خوش نہیں رکھ سکتا اور تیرے بغیر میں کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔''

''ہم چمائن، پیدائشی ابھاگن ہیں، مقدر کی اتنی دھنی نہیں ہو سکتیں، جدھر ناتھ دیا، ادھر چل پڑے۔''

دونوں ہاتھ کی ریکھاؤں میں مقدر کھوجتے ہوئے دور نکل گئے۔ چشم نم سے نکلنے والے دو گرم قطروں کو پونچھتے ہوئے ہاتھ لب لعلیں کو مس کرتے ہوئے پستانوں پر آ کر ٹھہر گئے۔ مسام جاں سے پھوٹنے والی خوشبو نے کچھ یوں مدہوش کیا کہ بند قبا کھلنے پر ہوش آیا۔ بروقت، برمحل۔ وہ محبت کا بہترین پیرائے میں اظہار نہیں کر سکے۔

صبح اس نے دالان میں خلیق صاحب کو گاؤں کے کچھ مقدمات نمٹاتے ہوئے دیکھا سو وہ بھی بغل میں جا کر بیٹھ گیا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو اس نے ہمت کر کے سروجنی کے تعلق سے بات کرنے کی کوشش کی۔

''ابو، سروجنی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔''

''ٹھیک خیال ہے، پڑھ رہی ہے، بہت سمجھدار ہے۔''

وہ بے خیالی میں بولتے گئے، پھر اچانک سے کچھ خیال آیا:

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تمہاری کیا عمر ہے۔''

''اٹھارہ''

''تمہیں اور آگے نہیں پڑھنا ہے؟''

''پڑھنا ہے۔''

''پہلے پڑھائی مکمل کر لو۔''

خلیق صاحب جہاندیدہ آدمی تھے، انہوں نے کوئی منظر منقش کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ یہ چند دنوں کا نشہ ہے، جلد اتر جائے گا۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ سروجنی بجی ہو گئی ہے۔ رگ جاں میں اتر گئی ہے۔ وہ پانی پر دوڑ رہا تھا اور چھینٹے نہیں اُڑ رہے تھے۔

بہرحال اشرف نے ان کے پورے وجود کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ اطمینان قلب چاہتے تھے اور یہ کویتا عطا نہیں کر سکی۔

''بڑے بابو! مجھے نہیں معلوم، ہل تو آپ نے بھی چلایا تھا، آپ ہی طے کرو۔'' کوئی ہاتھ اس نے اپنے شانوں پر محسوس کیا، خواب سے بیدار ہو گیا۔ سامنے اس کا باپ کھڑا تھا جو غالباً مسلسل طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے نحیف اور لاغر ہو گیا تھا۔ گال اندر کو دھنسے جا رہے تھے اور آنکھیں اسی تناسب سے باہر نکلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ تھی جیسے کوئی ویران حویلی میں آباد آسیب اپنے غیر آباد مکینوں کا استقبال کر رہا ہو۔

''یہاں کیوں بیٹھے ہو یہاں اب کوئی لالٹین نہیں جلے گی۔''

شام بتدریج شب دیجور میں ڈھل رہی تھی۔ خلیق صاحب نے سکوت توڑا:

''میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ میرے پاس اب گنے چنے دن بچے ہیں۔ تمہیں کھیت پر اس لئے بھیجتا تھا تا کہ تم گاؤں کے اوباش بچوں کی صحبت سے دور رہو اور اس مٹی کی بو باس تمہارے بدن کے ایک ایک پور میں سرایت کر جائے۔ تمہاری پرورش کو لے کر میں مطمئن تھا کہ ایک دن کویتا نے کچھ دیکھ لیا، پھر میں نے طے کیا کہ اس سے قبل کہ تم میری خاندانی عزت و شرافت کا جنازہ نکال دو، تمہیں شہر بھیج دینا مناسب رہے گا۔ تمہاری رپورٹ اطمینان بخش تھی، پھر تم ایک دن اچانک گاؤں آ گئے اور سروجنی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کر بیٹھے، میرے حواس معطل ہو گئے، میں نے فوری طور پر کوئی مزاحمت نہیں کی۔ طوفان کو خوش فہمیوں کے حوالے کر دیا تم خوش خوش شہر چلے گئے۔ طوفان شانت ہو گیا۔ اب تم انجینئر ہو گئے ہو، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم شادی کر لو اور آباو اجداد کی وراثت سنبھالو تا کہ میں اطمینان سے مر سکوں۔ میں نے

PDF Compressor Free Version

تمہارا رشتہ نزہت سے طے کر دیا ہے۔" اشرف کے ہوش اڑ گئے۔

"مگر وہ تو میری بہن ہے۔"

"نہیں! وہ تمہاری بہن نہیں ہے۔"

"سروجنی کہاں ہے؟"

"سروجنی گریجویشن تک اپنی ماں کے ساتھ یہیں تھی۔ کسی قدیم تاریخی مسجد کی مسماری کے بعد حالات پورے ملک میں کشیدہ ہو گئے، یہاں بھی تھے، خون خرابے کی خبریں آئے دن ریڈیو پر نشر ہو رہی تھیں، ہر طرف انسان نہیں مذہبی جنونی گھوم رہے تھے۔ اس دن سروجنی مجھے لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی تھی، معمول کے چیک اپ کے لئے۔ کسی ایک خارجی مولوی کی قیادت میں کچھ مذہبی انتہا پسندوں نے اس کے گھر پر دھاوا بول دیا، وہ ہندوؤں سے انتقام لینا چاہتے تھے، شکل کوئی بھی ہو، وہ کویتا کو دھمکی دے کر چلے گئے، کویتا اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکی۔ ایک معقول رشتہ تلاش کر کے فوراً سروجنی کے ہاتھ پیلے کر دیے۔ ایک بات اور..... تمہارا کوئی خط سروجنی تک نہیں پہنچا ہے۔"

اسے ایک ایک لفظ جھوٹ معلوم ہوا، قوت سماعت مفقود ہوتی گئی، کویتا کی موت اور سروجنی کی شادی دونوں قیامت خیز سانحے تھے۔ قیامت آ کر گزر گئی تھی اور اسے خبر ہی نہیں تھی۔ وہ جبراً سن رہا تھا، برسوں بعد اس کا باپ اسے کچھ سنا رہا تھا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سروجنی نے شادی کر لی ہے، اسے یقین تھا کہ سروجنی شادی نہیں کرے گی، حالانکہ اس نے ایسا کوئی عہد و پیمان نہیں کیا تھا، پھر بھی اسے یقین تھا۔

اشرف نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا، گویا چراغ بجھنے سے پہلے پھڑ پھڑا رہا ہے:

"میں سروجنی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اطمینان رکھو! جہاں بھی ہے، وہ بہت خوش ہے۔"

"کیا وہ زندہ ہے؟"

اپنے باپ سے اس نے کبھی بحث نہیں کی تھی، حالات، تعلیم، تجربے، مشاہدے اور دربدری کی بھٹی نے اسے میچور اور سنجیدہ بنا دیا تھا۔

"ہاں! مگر تمہارے لئے مر چکی ہے۔"

"یہ میں طے کروں گا۔"

"اب وہ تمہارے اختیار میں نہیں..... مجھے معلوم پڑا تھا کہ تم بہت ضدی ہو گئے ہو..... اسی لئے میں نے سروجنی کو یہاں سے بہت دور بھیج دیا ہے، اس حلف کے ساتھ کہ وہ یہاں کبھی نہیں آئے گی۔"

"کیا میں تمہارے لئے اب مر چکی ہوں، تم کچھ بتاتے کیوں نہیں، تم آتے کیوں نہیں، کسی خط کا کوئی جواب کیوں نہیں دیتے۔"

"یہ تمہارا آخری خط تھا جو مجھے موصول ہوا، اس کے بعد میں نے درجنوں خطوط تم کو لکھے، مگر کسی خط کا کوئی جواب نہیں آیا، کیا میں تمہارے لئے مر چکا ہوں، کچھ بولتی کیوں نہیں، کسی خط کا کوئی جواب کیوں نہیں دیتیں۔" خلیق صاحب کو لیوکیمیا ہو گیا تھا، وہ کچھ ہی دن میں وفات پا گئے۔ سروجنی کو کئی دن بعد نزہت کا ایک خط ملا۔ گاؤں میں اس کا بیشتر وقت تالاب کے کنارے جامنی سائے کے نیچے گزرتا تھا۔

"گیہوں کی بالیاں اب کتنی بڑی ہونے لگی ہیں؟"

ہواؤں کے خواب آگیں شور میں اسے ایک آواز سنائی دی، جانی پہچانی سی، اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہی خوش خرام آ رہی تھی۔ دور پیچھے نزہت کا ہیولیٰ بھی تعاقب کیے ہوئے تھا۔

"پگڈنڈیاں ہماری اب بھی بڑی ہیں دو لوگ ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔" اس نے خود کلامی کی۔

"کیا کر رہے ہو؟"

"تمہیں خراج پیش کر رہا تھا۔" تب تک نزہت بھی پہنچ گئی۔ کھیت کھلیان، تالاب اور باغات کی باتیں ہونے لگیں۔ سروجنی دو تین دن کے لئے آئی ہوئی تھی، بیشتر اوقات نزہت کے ساتھ رہتی، اشرف نے محسوس کیا کہ وہ قصداً اس سے اعراض کر رہی ہے۔ وہ سروجنی کو اسٹیشن پر چھوڑنے گیا تھا۔ پہلی بار سروجنی اسے مکمل ملی تھی۔

"چل بھاگ چلتے ہیں، ابھی بھی کوئی دیر نہیں ہوئی ہے۔"

"اب بہت دیر ہو چکی ہے۔"

گاڑی سیٹی بجا کر رینگنے لگی۔ وہ اپنی اصل میں دور ہوتی جا رہی تھی اور تخیل میں بہت پاس، بہت پاس ہوتی جا رہی تھی: "جو بالیاں تمہیں عزیز تھیں وہ نہیں دے سکتی، یہ صدیوں کی ریت ہے، کسی اور کے گناہوں کا کفارہ کسی اور نے ادا کیا ہے۔" ❁❁

PDF Compressor Free Version

ہما فلک

Oswald - Hesse Street, 53, 70469, Stuttgart, Germany (Mob. 00490176813382O1)

پانچواں موسم

''میں زندگی میں ایک بار ضرور بھاگنا چاہتی ہوں۔ یہ کیسی خواہش ہے؟ میں نہیں جانتی۔ کیا بے چینی ہے؟ کیسی تشنگی ہے، مگر ہاں ایک بار بس ایک بار..... بھاگ کر دیکھوں تو سہی.....''

''علینہ آپ اپنی کاپی دکھائیں.....'' ٹیچر سلمیٰ نے جیسے ہی اس کے قریب آ کر کہا، اس نے گھبراہٹ میں کاپی بیگ میں ڈال دی جس سے ٹیچر سلمیٰ کو حیرت سی ہوئی۔

''کاپی نکالیں، دکھائیں کیا چھپا رہی ہیں؟''

''وہ ٹیچر..... وہ دراصل.....'' علینہ نے ہکلا کر بات ادھوری چھوڑ دی، مگر وہ ان کے متعلق جانتی تھی کہ اب وہ ہر حال میں اس سے اگلوا کے ہی رہیں گی۔ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا تھا۔ وہ آج پہلی بار پھنسی تھی اور بری پھنسی تھی۔

''یہ کیا؟ میں نے کہا تھا کہ اے اور بی سبجیکٹس کی علیحدہ علیحدہ نوٹ بک رکھیں، لیکن آپ ایک ہی میں دونوں سبجیکٹس کا کام کر رہی ہیں؟''

''وہ دراصل میری دوسری کاپی گھر رہ گئی تھی..... تو.....'' علینہ شرمندہ سے لہجے میں کہہ رہی تھی، لیکن ٹیچر سلمیٰ کی نظروں کا سامنا کرنا دوبھر ہو رہا تھا۔

''بہت غلط بات ہے علینہ، کم از کم مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ یہ صریحاً دھوکہ ہے آپ مجھ سے کہہ سکتی تھیں۔''

یہ الفاظ سن کر اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ دوسری لڑکیاں تو یہاں ڈانٹ پڑتیں وہاں ہنسنے کھیلنے میں مگن ہو جاتیں، لیکن اس کے لئے چھوٹی سی بات بھی بہت بڑی ہوتی تھی۔ کوئی ایسا کام جس پر ڈانٹ پڑنے کا امکان ہوتا، وہ نہ کرتی تھی، مگر آج اس سے غلطی ہو گئی تھی، جو کہ اتنی بڑی تو نہ تھی، مگر اسے بہت محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی اس سے کسی کو بھی کچھ غلط کرنے کی امید نہ تھی بچپن سے ہی۔ سلجھی ہوئی نازک اور معصوم سی گڑیا جیسی جو نہ ضد کرنا جانتی تھی، نہ بلاوجہ رونا دھونا۔ اس سے ایک بڑا بھائی اور ایک چھوٹی بہن تھی۔ بڑے بھائی کا کہنا ماننا، بھاگ کر اس کا کام کرنا، تو چھوٹی بہن کا خیال رکھنا جیسے خود سے ہی اس نے اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔ اپنی اس سادہ فطرت کی وجہ سے ماں باپ کی آنکھ کا تارہ تھی، تو محلے والے اپنے بچوں کو اس کی مثالیں دیا کرتے تھے۔

بچپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے وہ خاندان کی سب سے قابل اور فرمانبردار لڑکی کے طور پر جانی جانے لگی تھی۔ کئی لوگ اشاروں کنایوں میں اس کے لئے بات کر چکے تھے، لیکن اس کے ماں باپ کی اور خود اس کی بھی خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے۔

کچھ لوگوں کی زندگی کتنی خوبصورت ہوتی ہے۔ نرم تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح جو چہرے کو چھو جائے تو روح میں بھی تازگی کا احساس بھر جاتا ہے۔ کیسی سہل زندگی تھی۔ ماں باپ، بہن بھائیوں کا پیار، دوست عزیز، محلے دار، سکول کالج کی سہیلیاں اور اب کچھ عرصہ سے اس نے ایک سکول میں شوقیہ جاب شروع کی ہوئی تھی۔ وہاں بھی چند دن میں ہی کولیگز اس کی خوش اخلاقی کی معترف ہو گئی تھیں۔ سچائی ایمانداری اور محنت سے کام کرنے کی وجہ سے پرنسپل بھی اس کی گرویدہ تھیں۔

اس کی زندگی کا ایک ہی اصول تھا احتیاط پسندی، ہر معاملے، ہر بات میں احتیاط، کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے، وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے کوئی پیچیدگی پیدا ہو۔ کسی کی کوئی بات بری لگتی بھی تو مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ خود کچھ ایسا کہہ دے اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

PDF Compressor Free Version

آسان اور سہل ترین زندگی کا اصول اس کی نظر میں یہی تھا کہ صرف اپنے مقصد، اپنی منزل پر نظر رکھو۔ نہ بے جا بحث و مباحثہ، نہ کسی سے الجھنا۔ جس حد تک ممکن ہوتا وہ کوشش کرتی اس سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہو۔ وقت کی پابندی، آداب محفل جیسی کتابی باتوں کو عملی طور پر اپنی زندگی میں شامل کر کے وہ اس میں بہت کامیاب بھی رہی تھی۔

ایک بہت اچھے گھر سے جب اس کے لئے رشتہ آیا تو ماں باپ نے رضامندی دے دی، اس نے بھی حسب توقع کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دوسرے دونوں بہن بھائی کی طرح ضد کر کے اپنی بات منوانا اسے نہیں آتا تھا، نہ ہی وہ کبھی کسی لڑائی جھگڑے میں پڑتی تھی۔ اس کے والدین اس کی اس فطرت سے بہت مطمئن اور مسرور تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ہر حال میں ان کے وقار کا خیال رکھے گی، پھر چاہے وہ جاب کرے یا سسرال میں ہو، وہاں بھی وہ سب کے دل جیت لے گی۔

یوں وہ خرم کی زندگی میں آ گئی۔

دلہن بنی سیج میں بیٹھی انتظار کی گھڑیوں میں شامل وہ اپنی دھڑکنیں گن رہی تھی۔ زندگی جیسے ایک نئے مکان میں داخل ہوئی، اپنے مکین کی پہلی دستک کا انتظار کر رہی تھی۔ جھکی ہوئی پلکوں کی چلمن سے اس نے دستک دینے والے ان ہاتھوں پر ایک نظر ڈالی۔

''زندگی کی اس نئی شروعات کو لے کر آپ کے دل میں بھی کچھ خدشات ہوں گے۔ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ میرے والدین کو آپ کبھی شکایت کا موقع نہ دیں۔ کبھی کوئی بات ہو، آپ مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔ یقین کریں میں بہت اچھا ساتھی ثابت ہوں گا۔'' کچھ ادھر ادھر کی باتیں کر کے نویل نے براہ راست یہ بات کہی تھی۔

''آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

علینہ نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اتنے پر یقین اور ٹھوس لہجے میں کہا کہ ایک پل کو نویل حیران رہ گیا، لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اسے اپنی اس حیرت کا جواب مل گیا تھا۔ دلہناپے کے ابتدائی دنوں میں ہی علینہ نے اس گھر کے تمام معمولات کا جائزہ لے لیا تھا اور جیسے ہی اس نے عملی زندگی میں قدم رکھا، بہت خوش اسلوبی سے اپنی ذمہ داریاں سرانجام دینا شروع کر دیں۔

علینہ کی رفاقت میں دن مہینے سال کیسے پر لگا کر گزرے، نویل کو اندازہ ہی نہ ہو سکا تھا۔ جہاں وہ دونوں بچوں کی تربیت پر خصوصی توجہ مرکوز رکھتی وہیں ہر سرد و گرم میں نویل کی بہترین ساتھی بھی ثابت ہوئی تھی۔ ''بھئی ہماری بیگم تو کبھی غلطی سے بھی کوئی غلطی نہیں کرتیں۔'' خرم سر محفل اسے سراہتا تھا اور فخریہ انداز میں اس بات کو دہراتا جسے سن کر علینہ کا سیروں خون بڑھ جاتا۔ زندگی جیسے انعام کی صورت ملی تھی۔ اپنا سجا ہوا گھر، اپنے بچے اور شوہر کو دیکھ کر وہ سرشار سی ہو جاتی۔ کب دن ڈھلا، کب رات ہوئی، کچھ خبر ہی نہ ہو سکی۔

ساس سسر کی وفات ہو چکی تھی، لیکن مرتے مرتے بھی ان کی زبان پر اس کی خدمات کا اعتراف تھا۔ دونوں بچے تعلیم مکمل کر کے اپنے گھروں میں خوش باش تھے۔ اب وہ تھی جسے ایک تابع فرمان بیٹی، تابعدار بہو، خوب سیرت اور مثالی ساتھی اور ایک بہترین ماں کے القابات سے نوازا گیا تھا اور جن کو پا کر ایک مکمل اور خوبصورت زندگی کا احساس اسے دوسرے بہت سے لوگوں سے ممتاز کرتا تھا۔

ایک شفاف زندگی، پانی جیسی صاف و شفاف، پانی جس کا کوئی رنگ نہیں ہوتا، نہ کوئی جسم ہوتا ہے جس نے جو رنگ ملایا اس میں رنگ گئی، جس نے جس سانچے میں ڈھالا اسی میں ڈھل گئی۔

شاید یہی وجہ ہے کہ میری زندگی ایک سبک ندی کی طرح بہتی چلی گئی۔ کوئی آندھی طوفان ایسا نہیں تھا جو میرے راستے میں رکاوٹ بنتا۔ وہ اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتی تو سوچتی۔

ہاتھ میں چائے کا مگ پکڑے وہ ٹیرس میں پڑی کرسی پر آ بیٹھی تھی، آرام کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے شفاف نیلے آسمان کو دیکھا۔ جاتی سردیوں کے دن تھے۔ بہار کی آمد تھی، موسم بہت خوشگوار تھا۔

چار موسم..... سردی، بہار، گرمی اور خزاں..... ایک کے بعد ایک موسم..... ایک ترتیب..... کوئی کمی نہیں، کوئی بیشی نہیں۔ ایک توازن، ایک تناسب اس کی زندگی کی طرح۔

''کبھی کوئی پانچواں موسم کیوں نہیں آیا؟''

شفاف نیلے آسمان پر نظریں ٹکائے یونہی ایک سوال اس کے من میں اٹھا۔

''کیوں سب ہمیشہ ٹھیک رہا۔ کیوں زندگی ایک سی گزر گئی۔

PDF Compressor Free Version

بے رنگ اور پھیکی، کیا میری زندگی بے رنگ اور پھیکی تھی؟ کیا اس میں واقعی چار موسم آئے؟ یا صرف ایک ہی موسم ٹھہرا رہا؟ بہار کا موسم..... علینہ کبھی کچھ غلط کر ہی نہیں سکتی، تم سے یہ امید نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتی۔ تم کرو گی ایسا؟ ناممکن ہے..... یہ کیسا اعتماد تھا جو مجھے ملتا رہا اور میں اسے ٹوٹنے سے بچانے میں لگی رہی۔ میں نے کبھی کسی سے اختلاف کیا نہ شکایت، نہ کسی کو شکایت کا موقع دیا۔ سب خوش رہیں مجھ سے، میں ہمیشہ یہی کوشش کرتی رہی اور سب خوش رہے بھی، لیکن کیا میں خوش ہوں؟ اگر سب ٹھیک ہے تو کمی کیا ہے؟ مجھے پانچواں موسم دیکھنا ہے..... میں زندگی میں ایک بار ضرور بھاگنا چاہتی ہوں۔ یہ کیسی خواہش ہے؟ میں نہیں جانتی۔ کیا بے چینی ہے؟ کیسی تشنگی ہے، مگر ہاں ایک بار، بس ایک بار..... بھاگ کر دیکھوں تو سہی۔ کچھ ایسا کر کے دیکھوں جو میں نہیں کر سکتی..... کچھ بالکل غلط۔'' ایک پل کو وہ اپنی سوچ کی اس شدت پر حیران ہوئی۔ وہ زندگی بھر جتنی محتاط اور قابل اعتماد رہی تھی اسے یہ سوچ اس کے بالکل متضاد محسوس ہوئی۔ ''میں نے اپنی تمام زندگی ایک پرسکون دریا کی طرح گزاری ہے، جو ایک ہی سمت میں بہتا ہے، مگر پانی بھی تو کبھی اپنے کنارے توڑ کر باہر نکلتا ہے۔ دریا بھی کبھی رخ بدلتے ہیں۔ میں بھی بہنا چاہتی ہوں اسی طرح، تیز کسی بے قابو دھارے کی طرح، سارے بند توڑ کے، بالکل آزاد فضاؤں میں سانس لینا چاہتی ہوں، جہاں کچھ غلط ہو جانے کا خوف نہ ہو۔ اس نے دور آسمان پر اڑتے ہوئے پرندے پر نظریں جما کر خود سے سوال کیا:

''کیا بھاگ جاؤں؟'' ❁❁

اردو کی عصری صورت حال (ص ۸ سے آگے)

اکادمی، اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد اور اس طرح کے دیگر اداروں کے پروگراموں کو زیادہ سے زیادہ مشتہر بھی کیا جائے اور ان سے استفادہ بھی کیا جائے۔

(۱۷) سچر کمیٹی اور دوسری کمیٹیوں کی روشنی میں مرتب کئے جانے والے سرکاری منصوبوں اور پروگراموں کو عمل میں لانے کی تدبیریں کی جائیں اور ایسا دباؤ بنایا جائے کہ وہ پروگرام کسی بھی مرحلہ پر کسی بھی وجہ سے کسی بھی صورت میں رکنے نہ پائیں۔

(۱۸) اردو کے جیالوں کی ایسی تنظیمیں بنائی جائیں جو اردو کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں، تنظیموں اور اسکولوں وغیرہ پر نظر رکھے اور وقتاً فوقتاً، اچانک ان تک پہنچ کر ان کا معائنہ کرے اور اس کی رپورٹ اخبارات و رسائل میں شائع کرائے اور ضرورت پڑے تو اسے حکومت کے متعلقہ محکموں تک پہنچائے اور دلوں میں یہ احساس جگائے کہ یہ زبان ابھی یتیم نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کے مشفقین ابھی موجود ہیں۔

(۱۹) تنظیمیں یہ مہم بھی چلائیں کہ اردو کا دعویٰ کرنے والے لوگ اپنی تقریبات کے دعوت نامے اردو میں چھاپیں اور دیگر کام بھی اردو میں کرنے کی کوشش کریں۔

(۲۰) وہ ریاستیں جن میں اردو کو سرکاری درجہ ملا ہوا ہے اور جہاں اردو میں کام کرنے کے لئے دفتروں میں اردو مترجم رکھے گئے ہیں ان کا ہاتھ بٹائیں اور حکومت کو یہ کہنے کا موقع نہ دیں کہ اردو میں درخواستیں موصول نہیں ہوتیں۔

(۲۱) کوشش کی جائے کہ مترجم کے عہدوں پر ایسے لوگوں کی تقرری عمل میں آئے جنہیں ترجمے کے فن کے ساتھ ساتھ اردو بھی آتی ہو۔

(۲۲) اردو کی بدولت بڑے عہدوں پر تعینات اعلیٰ افسروں کو عوام سے ملوانے اور ان کے منہ سے یہ کہلوانے اور تصدیق کرانے کا انتظام کیا جائے کہ اردو آئی۔ اے۔ ایس اور آئی۔ پی۔ ایس بھی بناتی ہے اور یونیورسٹیوں کی وائس چانسلری بھی دلواتی ہے۔

اگر مذکورہ بالا باتوں پر دھیان دیا گیا اور ان پر نیک نیتی اور سنجیدگی سے عمل کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ اردو اپنی موجودہ صورت حال کے تشویشناک دائرے سے باہر نکل سکتی ہے، بلکہ اپنا کھویا ہوا وقار بھی پا سکتی ہے اور یہ پھر سے ان کی بھی منظورِ نظر ہو سکتی ہے جنھوں نے فی الحال اس کی طرف سے اپنی نظریں پھیر لی ہیں۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

انشائیہ

پروفیسر اعجاز علی ارشد
وائس چانسلر مولانا مظہر الحق اردو فارسی عربی یونیورسٹی، پٹنہ

قصہ ایک راجہ کے وزیر ہو جانے کا

راجہ اپنے نرم گرم بستر میں سویا ہوا علاقے پر علاقے فتح کرتا جا رہا تھا کہ یکا یک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے تعجب ہوا کہ آنکھ کھلی کیسے؟ اس نے تو سوتے وقت معمول کے مطابق دو پیگ چڑھائے تھے اور سلیپنگ پلس ...... اس نے سوچا شاید آج کل راجاؤں کو بھی نقلی دوائیں سپلائی ہونے لگی ہیں؟ یکا یک فون کی گھنٹی بج اٹھی اور اسے بے وقت آنکھ کھلنے کا سبب سمجھ میں آ گیا، ساتھ ہی بے حد غصہ بھی آیا کیونکہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جب وہ سو رہا ہو تو فون کی لائن ڈسکنکٹ کر دی جائے۔ وہ جانتا تھا کہ صبح صبح غصہ کرنا اس کے لئے خطرناک ہے چونکہ صرف پچھلے چار سال کے عرصے میں ہی اسے دو بار ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا اور بلڈ پریشر کی شکایت تو اب بھی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا اور آرام کرنے کا سب سے بہتر طریقہ اس کی نظر میں یہی تھا کہ ہجوم رنگ و بو میں وقت گزارا جائے، اس لئے پچھلے کئی مہینوں سے وہ یہی کر رہا تھا، مگر اس وقت پہلو خالی تھا اور فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

راجہ نے پہلے تو ٹیلی فون کی ماں بہنوں سے اپنی رشتہ داریوں کا اعلان کرتے ہوئے ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دیا، پھر اس عمل سے جھنجھلاہٹ کچھ کم ہوئی تو چلا چلا کر نوکروں کو آواز دینے لگا۔ دوسری ہی آواز پر ایک نوکر ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا اور جھک کر سلام بجا لایا۔

راجہ نے سختی سے پوچھا:

''یہ فون کی لائن کس نے ملا دی؟''

نوکر بولا: ''حضور اب وزیر ہو گئے ہیں، بیگم صاحبہ نے مبارکباد دینے کو فون کیا تھا۔''

راجہ کو پھر غصہ آ گیا۔ وہ چیخ کر بولا:

''میں اور وزیر، تم گھاس تو نہیں کھا گئے۔''

نوکر نے دوبارہ بولنے کی جرأت کی:

''حضور بیگم صاحبہ......''

راجہ برس پڑا:

''کیا بیگم بیگم بکتے ہو۔ یہ کون سی خوشی کی بات ہے؟''

نوکر نے اور بھی کچھ کہنا چاہا، مگر اس کی آواز راجہ کی آواز میں دب کر رہ گئی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

''میں اور وزیر...... میں وزیر کیسے ہو سکتا ہوں، میں تو کئی پشتوں سے راجہ ہوں...... میں ابھی تم سب کو نوکری سے برخاست کرتا ہوں، نکل جاؤ یہاں سے۔''

وزیر بنتے ہی راجہ نے بہادری کا یہ پہلا کام کیا تھا اور پھر تو ایسے کاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کئی نوکر نکالے گئے اور کئی خادماؤں کو برخاست کر دیا گیا، لیکن دھیرے دھیرے راجہ کا غصہ ٹھنڈا ہوتا گیا۔ جب اس کے دوستوں، رشتہ داروں اور سب سے بڑھ کر نئی محبوبہ نے بار بار اسے یہ سمجھایا کہ وزیر ہو جانے کے بعد اسے راجہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہو جائیں گے تو وہ مجبوراً وزیر بن جانے پر تیار ہو گیا، مگر اس نے یہ شرط بھی لگا دی کہ وہ اپنے نام سے راجہ کا لفظ الگ نہیں کرے گا۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ ہی گیا جب راجہ پہلی بار وزیر کی حیثیت سے سکریٹریٹ میں داخل ہوا۔ ایک بڑے مجمع نے اس کا استقبال کیا اور زندہ باد کے نعرے لگائے۔ راجہ کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ اپنے چیمبر میں جاتے ہی اس نے سب سے پہلے سکریٹری کو طلب کیا اور پوچھا:

''یہ باہر دروازے پر اتنی بھیڑ کیوں ہے؟''

سکریٹری نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا:

PDF Compressor Free Version

''یہ لوگ آپ کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کر رہے ہیں اور آپ سے انعام کے طلب گار ہیں۔''

راجہ خوش ہوگیا۔ اس نے فوراً حکم دیا:

''انہیں ایک ایک بیگھہ زمین انعام کے طور پر دی جائے۔''

''لیکن حضور'' سکریٹری ڈرتے ڈرتے بولا:

''یہ لوگ زمین نہیں بلکہ کونٹا اور پرمٹ چاہتے ہیں۔''

راجہ کے لئے یہ الفاظ کچھ نئے تھے، مگر اس نے پہلے دن اپنی کم علمی کا اظہار مناسب نہ سمجھا، اس لئے نہایت شان سے بولا:

''ان لوگوں سے کہہ دو کہ جلد ہی ان کی خواہش پوری کر دی جائے گی۔'' اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ دور دراز سے لوگ راجہ کے پاس درخواستیں لے کر آتے اور بدلے میں وعدوں کا سہارا لے کر راجہ کی خوش مزاجی، نیک دلی اور ہمدردی کے گن گاتے ہوئے لوٹ جاتے۔ راجہ دھیرے دھیرے پکا وزیر بنتا جا رہا تھا، مگر انہیں دنوں ایک واقعہ ہوگیا۔

راجہ کا ایک پرانا خدمتگار کوئی کام لے کر آیا۔ راجہ چاہتا تو اسے بھی وعدوں کی سلیپنگ پلس کے سہارے سلا دیتا، مگر نہ صرف اس نوکر نے بلکہ اس کے باپ اور دادا نے بھی عمر بھر راجہ کے خاندان والوں کی خدمت کی تھی، اس لئے راجہ نے اس کا کام کر دینا ضروری سمجھا۔ مشکل یہ تھی اب تک وہ صرف کام کر دینے کا وعدہ کر رہا تھا اور اب سوال کام کر دینے کا تھا، اس لئے اس نے نوکر ہی سے پوچھا:

''یہ کام کیسے ہوسکتا ہے؟'' نوکر بولا:

''حضور اگر وزیر اعلیٰ سے سفارش کر دیتے تو میرا کام ہوجاتا۔''

راجہ نے یہ بات اپنی شان کے خلاف سمجھی کہ وہ کسی دوسرے کے پاس سفارش لے کر جائے۔ اس نے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ وزیر اعلیٰ کو فوراً بلوایا جائے۔ یہ سکریٹری نیا نیا آیا تھا، مگر بی۔اے میں اس نے ہسٹری آنرس لے رکھا تھا، اس لئے راجاؤں کا مزاج پہچانتا تھا، اس نے معاملہ برابر کرنے کی نیت سے کہا:

''حضور اپنی غریب پروری کا ثبوت دیتے ہوئے خود ہی وزیر اعلیٰ کے یہاں چلے جائیں تو بہتر ہے۔'' راجہ کو یہ بات پسند آئی اور اس نے سکریٹری کو ترقی دے کر اپنا وزیر بنا دینا چاہا، پھر اسے خیال آیا کہ اب تو وہ خود ہی وزیر ہے، اس لئے خاموش رہا۔

دن گزرتے گئے اور راجہ آہستہ آہستہ وزارت کے رسوم و رواج سے پوری طرح واقف ہوگیا۔ دوستوں نے اسے بتایا کہ اچھا وزیر ہونے کے لئے برابر کچھ نہ کچھ وعدے اور اعلانات کرتے رہنا، مسائل حل کرنے کی بجائے الجھانا اور زیادہ سے زیادہ خود نمائی ضروری ہے۔ اب وہ ایک دن میں اوسطاً دس جلسوں کا افتتاح کرتا، پانچ کی صدارت کرتا اور تین میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود ہوتا تھا۔ ہر جلسے میں اسے کچھ نہ کچھ بولنا بھی پڑتا تھا جس کے لئے اس نے اپنے ایک صحافی دوست کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ وہ روزانہ راجہ کے لئے لکچرس تیار کرتا، نوٹ بناتا اور بدلے میں راجہ سے کسی نہ کسی اعلیٰ سرکاری کمیٹی کا چیرمین بنا دینے کا وعدہ کر لیتا۔ وقت شاید اسی طرح گزرتا رہتا کہ اچانک پھر ایک واقعہ ہوگیا۔

راجہ پارٹی ورکروں کی ایک میٹنگ میں تقریر کر کے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ہڑتالی اسٹوڈنٹس کے جلوس نے اس کی گاڑی گھیر لی۔ راجہ اپنے پرانے فارم میں ہوتا تو ان سبھوں کو سولی پہ لٹکوا دیتا یا گولیوں سے چھلنی کروا دیتا، لیکن اب وہ وزیر ہوگیا تھا اور وزارت کا تقاضہ ہوش مندی کا تھا، اس لئے وہ مسکراتا ہوا گاڑی سے اتر آیا۔ جلوس نے اسے دیکھ کر سرکار کے خلاف نعرے لگائے۔ جواب میں راجہ کو کچھ نہ کچھ کہنا ہی تھا، مگر وہ صحافی دوست موجود نہ تھا، بہر حال مصیبت میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے، اس لئے راجہ نے اپنی یادداشت سے کام لینے کا ارادہ کیا۔ پارٹی میٹنگ میں کی جانے والی تقریر اسے زبانی یاد تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا:

''بھائیو اور بہنو! آپ جو دور دور سے چل کر یہاں آئے ہیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ میری پارٹی اور سرکار پہ پورا بھروسہ کرتے ہیں اور اس کے کاموں سے بہت خوش ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آئے دن ہڑتالوں نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے، مگر ہم نے بھی طے کر لیا ہے کہ ہڑتال کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں گی۔ ہم کسی کو من مانی نہیں کرنے دیں گے.....''

مجمع میں غصے کی لہر دوڑ گئی اور راجہ کو اتنی عقل تو اب آ ہی گئی

PDF Compressor Free Version

تھی کہ وہ مجمع کے غصے کا اندازہ کر لیتا، اس لئے اس نے تقریر کا ایک دوسرا حصہ دہرانا شروع کیا:

''ہماری حکومت نے طالب علموں کی بڑھتی ہوئی غنڈہ گردی سے نپٹنے کی تیاری کر لی ہے اور.....'' مجمع نے پھر ہنگامہ شروع کیا۔ راجہ نے اپنی تقریر کو ایک دوسرا موڑ دیا:

''اس دیش کو آج پھر بلیدان کی ضرورت ہے۔ ہمیں آپ کا خون چاہئے تاکہ ہم بلڈ بینکوں کو.....''

راجہ کے آخری الفاظ ہجوم کے بے پناہ شور وغل میں گم ہو گئے۔ بھیڑ بے قابو ہو گئی اور سپاہیوں کو راجہ کی مدد کے لئے آگے آنا پڑا۔ راجہ نے اس دن اپنے صحافی دوست کو بلوایا اور اس سے فرمائش کی:

''تم مجھے ایک ایسی تقریر لکھ دو جو ہر موقع پر کام آسکے۔''

صحافی نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی اور کمرے سے نکل بھاگا، لیکن اس کے باہر جاتے ہی راجہ نے اپنے ایک دوسرے دوست سے کہا: ''یہ حرام..... یہ بڑا موذی ہے، اس کی وجہ سے آج میں مار کھاتے کھاتے بچا۔'' وہ دوست کچھ نہ بولا۔ اسے معلوم تھا کہ راجہ اس کے بارے میں بھی پیٹھ پیچھے اکثر انہیں خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

بہر حال یہ بات آئی گئی ہو گئی، مگر پھر تو اس قسم کے واقعات کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسری ریاست کی ایک اکادمی نے راجہ کی ریاست میں رہنے والے ایک مشہور دانشور کو انعام سے نوازا۔ وہ دانشور بیمار تھا اور اس لئے اکادمی کے صدر خود انعام لے کر اس کے پاس پہونچے۔ راج بھون میں نشست ہوئی جس میں راجہ کو بھی دعوت دی گئی۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا:

''میں اپنے دوست کا بے حد شکر گزار ہوں کہ وہ انعام لینے کے لئے ایک دوسری ریاست سے یہاں تشریف لائے۔''

حاضرین اس غلط بیانی پر اپنی ہنسی نہ روک سکے، مگر راجہ نے اسے اپنی تعریف سمجھا۔ کہنے لگا:

افسوس کہ ان کے جیسا دانشور ہمارے یہاں نہ پیدا ہو سکا، مگر یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آج وہ اتنی دور سے یہاں آئے ہیں اور ہم ان کو انعام دے رہے ہیں۔''

راجہ کچھ اور بھی بولتا، مگر تالیوں کے شور نے اسے بولنے ہی نہ دیا۔ بعد میں کچھ لوگوں نے بتایا کہ جس دانشور کو وہ باہر سے آیا ہوا سمجھ رہا تھا وہ تو یہیں پیدا ہوئے اور اب بھی یہیں رہتے ہیں، البتہ انہیں انعام دینے والے دوسری ریاست سے آئے تھے۔ راجہ قائل نہ ہوا۔ وہ برابر یہی کہتا رہا کہ اگر اس نے کوئی غلط بات کہی ہوتی تو لوگ اس قدر تالیاں نہ بجاتے۔

چند ہی دنوں بعد دو اور واقعات ہوئے۔ راجہ کے پاس ایک پرموشن کی فائل آئی اس نے Suspended لکھ کر فوری معطلی کا حکم صادر کر دیا۔ پھر دو اور فائلیں آئیں۔ ایک پروفیسر کا دوران ملازمت انتقال ہو گیا تھا اس کے لئے انکوائری کروانی تھی۔ ایک لڑکے نے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی اس کے لئے نوکری کی سفارش کرنی تھی۔ راجہ نے فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے والے لڑکے کے خلاف انکوائری کا حکم دے دیا اور مرحوم پروفیسر کے لئے نوکری کی سفارش کر دی۔

آخر کار خود راجہ کو بھی ان غلطیوں کا تھوڑا بہت احساس ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ اب اپنے سکریٹری سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرے گا۔ اسے اتفاق کہئے کہ قسم کھانے کے دوسرے ہی دن راجہ کے پاس ایک ٹرانسفر کی فائل آئی۔ راجہ نے سکریٹری سے مشورہ کرنے کے بعد ٹرانسفر کا آرڈر کر دیا۔ دو تین دنوں بعد ہی وہ شخص پریشان حال راجہ کے پاس پہونچا۔ راجہ اس وقت صبح کی سیر سے واپس آیا تھا۔ اس نے ڈپٹ کر پوچھا:

''کیا بات ہے؟''

وہ آدمی کہنے لگا: ''ٹرانسفر تو حضور نے کر دیا ہے مگر جو آدمی وہاں کام کر رہا ہے وہ چارج نہیں دیتا۔''

راجہ کا سکریٹری اس وقت اپنے گھر پر بیٹھا پچھلے دن کی آمدنی کا حساب کر رہا تھا، مگر اس طرح کے چھوٹے موٹے معاملات تو راجہ اب خود بھی سمجھنے لگا تھا۔ اس لئے بہت بے نیازی سے بولا:

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، پہلے ہم دیکھیں گے کہ تمہارے خلاف کیا چارج ہے، پھر کوئی آرڈر کریں گے۔''

غریب آدمی نے کچھ بولنے کی ہمت کی:

PDF Compressor Free Version

''حضور! چارج میرے خلاف نہیں بلکہ وہ شخص.....''

مگر راجہ نے اس کی بات بیچ ہی میں کاٹ دی، وہ جھڑک کر بولا:

''جاتے ہو یا نہیں۔ مجھے بھی تم نے کوئی جاہل وزیر سمجھ رکھا ہے کہ جو چاہو گے کرالو گے۔''

شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ راجہ اب تجربہ کار وزیر ہو چکا تھا۔ اس کے کام میں سست رفتاری آنے لگی تھی اور ہوس میں تیزی۔ اب وہ وعدہ کر کے بھول جانے، چولا بدلنے اور باتیں بنانے میں ماہر ہو گیا تھا۔ خود آرام کا ٹھیکہ لے کر کام کی ساری ذمہ داری اس نے سکریٹری پر ڈال دی تھی۔ اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ اس کے کامیاب وزیر بن جانے میں بس ایک ہی کمی ہے۔ وہ ابھی بھی لوگوں کو صرف دینے کا قائل ہے، ان سے کچھ لینے کا نہیں۔ راجہ بھی دوستوں کے اس احساس سے باخبر تھا، مگر عادت اتنی جلد کہاں بدلتی ہے؟ بہرحال اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کبھی خدا نے موقع دیا اور وہ وزیر سے دوبارہ راجہ بن گیا تو اپنے سکریٹری کو وزیر کی حیثیت سے ساتھ رکھ لے گا، لیکن انہیں دنوں ایک حادثہ ہو گیا۔ ایک دن راجہ اپنے دفتر میں تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ اس لئے راجہ نے خود ہی فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے ایک آواز آئی: ''کیا سکریٹری صاحب بول رہے ہیں؟''

راجہ کے دل میں نہ جانے کیا سمائی، اس نے آواز بدل کر کہا: ''جی ہاں! فرمایئے میں سکریٹری بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے بولنے والے شخص نے اپنا دکھڑا رونا شروع کیا: ''آپ نے اب تک وزیر صاحب سے میرا کام نہیں کروایا، حالانکہ میں نے آپ کو سب کچھ دیا اور جو مزید رقم آپ نے مانگی تھی اس کا بھی میں نے وعدہ کیا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ بغیر عورت کے وہ کام نہیں کرے گا تو میں اس کے لئے.....''

راجہ کے غصے کی حد نہ رہی۔ اس نے فون پر ہی گالیاں بکنی شروع کر دیں:

''حرام..... کتے..... مادر..... میں سکریٹری نہیں خود وزیر بول رہا ہوں۔ کس حرام..... نے تجھ سے پیسہ لیا ہے۔ ابھی اسے درست کرتا ہوں۔''

پھر اس نے فون ٹیبل پر پٹخا اور غصے میں بھرا ہوا سکریٹری کی تلاش کرنے لگا، لیکن سکریٹری اس سے زیادہ ہوشیار تھا۔ وہ نہ صرف راجہ کا گھر بلکہ شہر بھی چھوڑ چکا تھا۔

اب راجہ بے حد افسردہ رہنے لگا۔ وہ روز خدا سے دعا کرتا کہ اس کی وزارت ختم ہو جائے آخر کار اسے ایک دن خبر ملی کہ اب وہ وزیر نہیں رہا۔ اسے بڑی مسرت ہوئی کہ اس کا بن باس ختم ہوا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور پھر اپنی ریاست میں واپس چلا گیا۔ راجہ کی حیثیت سے زندگی گزارتے ہوئے اب وہ بہت خوش ہے، مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ اس کے کچھ دوست وزیر کے عہدے سے ہٹائے جانے پر اتنے غمزدہ کیوں تھے؟ شاید اس لئے کہ وہ راجہ نہیں بن سکے؟ ❁❁

عالم خورشید کی نئی غزلیں (ص ۱۶ سے آگے)

ہمارے زخم ہی یہ کام انجام دیتے ہیں
ضرورت ہی نہیں پڑتی لبوں کو مسکرانے کی

کم سے کم دیکھ تو لیتا میں فصیل زنداں
میری زنجیر کو وسعت ہی ذرا دی گئی کیا

نہ ہم اہل خرد ہیں نہ اہم اہل جنوں ہیں
نہ یہ بستی ہماری نہ وہ صحرا ہمارا

عجیب خطہ شاداب ہیں مری آنکھیں
ہزار خشک ہو موسم یہاں نمی ہی رہی

اتار لائے ترے چاند کو خرابے میں
فسردگی تجھے آخر نہال کر تو دیا

یہاں یوں ہی نہیں دہشت کا عالم
کبھی یہ شہر بھی جنگل رہا ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

منظومات

قوسؔ صدیقی

Phulwarisharif, Patna (Mob. 9931713567)

حمد پاک

بن دیکھے تجھ کو چاہوں حقیقت نہیں ہے کیا
اے رب ذو الجلال! ودیعت نہیں ہے کیا

میرا وجود تجھ سے ہے ، تیری شناخت کون
حسن تبادلے کی ضرورت نہیں ہے کیا

رب قدیر! سارے تماشوں کے باوجود
دیدارِ خاک! ذوقِ لطافت نہیں ہے کیا

کتنے یقیں سے خاک میں گوندھا تھا نور کو
تخلیق کار! شانِ مہارت نہیں ہے کیا

تو پا کے مجھ کو خوش ہوا ، میں تجھ کو پا کے خوش
سب کچھ تری رضا کی بدولت نہیں ہے کیا

سب سے بڑی جہاد ہے خود نفس کے خلاف
اس رَن میں زخم کھانا شجاعت نہیں ہے کیا

رب کریم! ساتوں زمیں ، ساتوں آسماں
نقش برید! آخری حجت نہیں ہے کیا

تو ہی تو لا شریک ہے ، مولائے لا زوال
اظہارِ سبز پوش ضمانت نہیں ہے کیا

تو نے قلم کو جتنی عطا کی ہیں ممکنات
شہر سخن میں قوسؔ کی شہرت نہیں ہے کیا

❁❁❁

نعت شریف

رب نے تجھے بنایا حقیقت کا آئینہ
ورنہ تہہ غبار تھا قدرت کا آئینہ

ہر عکس میں ہے اس کی ادا کی ادائگی
تیرا جمال اس کی ضرورت کا آئینہ

ہے تیرا نام شانِ شفاعت کا حوالہ
تیرا وجود بزمِ رسالت کا آئینہ

جب حسن کائنات میں اس کو کمی لگی
تجھ کو بنایا اپنی طبیعت کا آئینہ

اس عظمت جمیل پہ ''توقیریت'' تمام
ہے اس کے بعد ختم نبوت کا آئینہ

اے ''نقش تاب'' رحمت العالمین تو
تیرے قدم کی دھول ہے رحمت کا آئینہ

جس سے ملا ہے طالب و مطلوب کو قرار
ہے قوسؔ اصل میں وہ محبت کا آئینہ

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

سلیم شہزاد

Shahzad Jewellers, Liaquat Bazaar, Quetta Cant
Balochistan, Pakistan (Mob.923003888463)

سات جنموں کی الجھی کتھا نظم ہے

نظم کہتی ہے "آ"
آجا..... کھیلیں ذرا
"میں تجھے ڈھونڈلوں"
تو مجھے ڈھونڈنا
آئینوں میں کہیں
پتھروں کے تلے
سانولی دھوپ میں
رنگ میں، روپ میں
ڈھونڈ دریاؤں میں
تپتے صحراؤں میں
ڈھونڈنے سے کہیں
نظم ملتی نہیں
ہاں مگر ہے..... یہیں
"نظم کہتی ہے یہ"
تو کبھی کچھ تو بول
خالی جیبیں ٹٹول
میں ہوں بازار میں
تاجروں میں گھری ہوں میں، سکوں میں
چھن، چھن کی جھنکار میں
میں صدائے اناالحق ہوں
"منصور" ہوں
ڈھونڈنے کو مجھے، حوصلہ چاہئے
"آ چلیں دار میں"
"یعنی"
اس پار میں
نظم پاتال میں
ہجر کی شال میں
چھپ کے بیٹھی نہ ہو
الجھے مصرعوں کے جالے میں اٹکی نہ ہو
نظم زخمی نہ ہو!
"دیکھ اے گل قبا"
یہ تو خوشبو سی ہے
سونگھ جائے تو
دسترس میں نہیں
جس طرف جائے گی
پھیلتی جائے گی
کھیلتی جائے گی
خاک کے رقص میں
موج ہر عکس میں
دور تک دوڑتی، جھومتی جائے گی
"نظم پیروں سے روندا ہوا پھول ہے"
میں نے ڈھونڈا بہت
چاک پر خاک میں
خس میں، خاشاک میں
نظم ملتی نہیں
نظم زنداں میں ہے
رسم زنجیر میں
سخت پہرے میں ہے
کس اندھیرے میں ہے
جاؤ، دیکھو ذرا
معنی نظم میں
روشنی کچھ نہیں
زندگی کچھ نہیں
"دوستی کچھ نہیں"
نظم رستہ بنے "میں" پھروں دربدر
اِس نگر، اُس نگر
بس یہاں سے وہاں
گھومتے، جھومتے
زندگی، ڈھونڈتے
"زندگی" سا ہی کچھ

PDF Compressor Free Version

''اس کی'' آنکھوں میں ہے
اس کی آنکھوں میں ہے
''اپنی آوارگی''
دلکشی، مے کشی
شوق وارفتگی
اور
زماں ومکاں
یہ جہاں، وہ جہاں
ہم کہاں، تم کہاں
چھوڑ سب درمیاں
''نظم کو ڈھونڈ لیں''
''کیکٹس پہ رکھا دل بھی اک نظم ہے''
نظم آنکھوں سے ٹوٹے ستاروں میں گم
ٹشو پیپر کے ٹکڑے میں لپٹی نہ ہو
نیلگوں آسمانوں کے
آنچل تلے
نظم بادل نہ ہو
ایک تصویر میں
بہتا کاجل نہ ہو
کچی مہندی کی خوشبو میں
بھیگے ہوئے
سات رنگوں میں، وعدوں میں
لپٹی ہوئی
''اوڑھنی'' نظم ہے
جس کو خود سر ہوا

لے اڑی ہے کہیں
''وہ بھی تو نظم ہے''
میں تو ملتا ہوں پر، نظم ملتی نہیں
نظم تتلی کی مانند تکتی نہیں
آؤ، بیٹھیں کہیں
دو گھڑی، چار پل
ہم نے پیروں میں باندھے ہیں کیسے سفر
لمس کے شہر میں
رنج میں ڈوب کر
''آج جی لیں ذرا''
کل کی کس کو خبر؟
''اپنی سادہ سی خواہش یہاں نظم ہے''
نظم خوابوں سے آگے سرابوں میں ہے
کن عذابوں میں ہے
''دشت میں جو ملے آبلے نظم ہیں''
سلسلے، راستے، فاصلے نظم ہیں
شام ہوتے ہی جب
پنچھی گھر آئیں گے
یہ بھی تھک ہار کر
دیکھ! لوٹ آئے گی
''نظم مل جائے گی''
ایک مدت ہوئی
راہیں تکتے ہوئے
آنکھ پتھر بنی
کیا تماشہ ہے یہ

''شام ہونے کو ہے''
نظم ملتی نہیں
کھڑکیاں کھول دو
سانس آتی نہیں!
''حبس میں نظم ہے''
چاند میں داغ ہیں
اور گم سم ہوا
پیڑ خاموش ہیں
جیسے ''تم'' اور ''میں''
''نظم مجذوب ہے''
دل پریشان ہے
آنکھ حیران ہے
سر ہیں بکھرے ہوئے
نظم کہتی ہے یہ
سوز دے، ساز دے
''مجھ کو آواز دے''
میں ترا ہی ہنر اور ترا عیب ہوں
''سلسلہ غیب ہوں''
''جانتا ہوں یہ میں''
نظم مجھ سے ملے گی
تو کھو جائے گی
میں بھی آسیب ہوں
''سلسلہ غیب ہوں''
''سات جنموں کی الجھی کتھا نظم ہے''

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

احمد نثار

Sub Editor Quarterly "Dastaras" Kids Campus School, Mohammad Ali Road
City Colony, Post- 'B' Polytechnic, Dist. Dhanbad 828130 (Jhar.) (Mob. 08409242211)

یوں امتحان لیا خاکداں بنا کے مجھے

سمجھ رہا تھا سکوں پائے گا جلا کے مجھے
وہ خوش کہاں ہے بتا خاک میں ملا کے مجھے

خمار دے گیا نظروں سے وہ پلا کے مجھے
نشے میں چور کیا اور گیا بھلا کے مجھے

رلانے والا ہی لگتا ہے تو ہنسا کے مجھے
بنا کے طفل نہ بہلا یہاں لبھا کے مجھے

میری خبر نہیں مجھ کو کئی دنوں سے یہاں
میرا پتہ تو بتا میرے پاس آ کے مجھے

میرے بغیر مکمل نہیں حیات تیری
تیرا وجود مکمل بنے گا پا کے مجھے

اِدھر ہے آگ ، اُدھر بارشیں ہیں پتھر کی
یوں امتحان لیا خاکداں بنا کے مجھے

بلا رہا تھا مہکتا حسیں بہارِ چمن
اُڑا کے لائے ہیں جھونکے یہاں ہوا کے مجھے

بکھر گیا ترا شیرازۂ وفا اب کہ
حوالے دینے لگا تھا کہاں وفا کے مجھے

بڑے سلیقے سے پوشیدہ خانہ دل میں
وہ اپنے راز کئے رازداں بنا کے مجھے

دیارِ غیر میں ، تنہائیوں کی شورش میں
خموشیوں کی صدائیں ، گیا سنا کے مجھے

دھڑکتے دل کی تمنائیں سو گئیں لیکن
تمام عمر نہ سوؤں ، گیا جگا کے مجھے

کنارے بیٹھ کے طوفاں سے کیا بھلا نپٹوں
اُتار بحر میں اور دیکھ آزما کے مجھے

جو ہم نوا تھا وہ خوشبو بنے بکھر تو گیا
گلوں کے رنگ میں دیکھو گیا بسا کے مجھے

یہ سارا کھیل تیری حکمتوں کا لگتا ہے
ہر ایک زاویہ تکتا جلا بجھا کے مجھے

جناب آپ انا کے حصار سے نکلو
یقین ہے تو ذرا لے چلو نبھا کے مجھے

کئی دنوں سے شکایت یہ کر رہا تھا وہ
سنبھالنے کا نہ دعویٰ کرو گرا کے مجھے

دیا جلا ہوا رکھتا ہوں بام پر اس کے
مگر وہ دیتا ہے ٹوٹا دیا بجھا کے مجھے

یہاں تو خوف کا منظر ہے خامشی ہر سو
تمہاری یاد کہاں لائی ہے بہا کے مجھے

نہ عیب تھے میرے چہرے پہ نا ہی گرد و غبار
وہ ہنس رہا تھا یوں ہی آئینہ دکھا کے مجھے

پتہ چلے گا میرا ظرف کیا ہے دنیا کو
جناب آج مخالف کرو ہوا کے مجھے

چراغِ علم ہوں روشن کرو جناب نثار
شرارہ جان کے جانا نہیں بجھا کے مجھے

PDF Compressor Free Version

فردوس گیاوی

Arif Nagar, Gewal Bigha, Gaya 823001 (Mob. 9546037777)

پھر تیری یاد دبے پاؤں چلی آئی ہے

پھر درد میرے سینے میں آج اُٹھا چپکے سے
پھر تیری یاد دبے پاؤں چلی آئی ہے
پھر تیری یاد نم کر گئیں آنکھیں میری
پھر تیری یاد نے آج رلایا ہے مجھے
پھر تیری یاد کی پروائی چلی رات گئے
پھر تیری یاد کے دریا میں لگایا غوطہ
پھر تیری یاد کی لہروں نے دور تلک پہنچایا
پھر تیری یاد کا کنول جاگ اٹھا
پھر تری یاد کے سورج نے مجھے چمکایا
پھر تیری یادوں کی خوشبو سے
مہک اٹھا ہے آنگن میرا
پھر تیری یادوں کی ٹھنڈی چاندنی میں
نہایا میں نے
آج پھر تیرے نہ ہونے کا
احساس ہوا شدت سے
بن تیرے آج رخصت ہوئی ہے بیٹی
تلاشتی رہی بچوں کی آنکھیں
ماں کا چہرہ
وقت رخصت کتنا روئی تھی ہماری بیٹی
جو میرا فرض تھا وہ پورا کیا ہے میں نے
مگر یہ کسک
مار ڈالے رہی ہے مجھ کو
کہ بن تیرے
آج رخصت ہوئی بیٹی
پھر درد میرے سینے میں آج اٹھا چپکے سے
پھر تیری یاد دبے پاؤں چلی آئی ہے
تم جو ہوتی تو کچھ اور ہی منظر ہوتا
تم جو ہوتی تو خوشیوں میں اضافہ ہوتا
مجھ کو اکیلے پن کا یہ احساس
گلا دبا رہا ہے میرا
اکیلے پن کا یہ زہر
اتر رہا ہے بوند بوند میرے اندر
کیوں تم نے اپنا عہد وفا توڑ دیا
ساتھ جینے کا، ساتھ مرنے کا
ایسے جاتا ہے کوئی
بھلا روٹھ کر کوئی اپنوں سے
تم نہیں ہو تو کچھ بھی
اچھا نہیں لگتا مجھ کو
اب تو تمام عمر
تیری یاد کے صحرا میں جھلسنا ہے مجھے
پھر درد میرے سینے میں آج اٹھا چپکے سے
پھر تیری یاد دبے پاؤں چلی آئی ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ظفر کمالی

Ismail Shaheed (M.M.Colony) Mill Road, Siwan 841226

رباعیات

چالاک کرے دل کو ساقی وہ شراب　　افلاک کرے دل کو ساقی وہ شراب
پینے کے لئے اور کوئی جام نہ دے　　جو پاک کرے دل کو ساقی وہ شراب

❁❁❁

بندھوانے کو بندھوالے دستار کوئی　　مشکل ہے کہ ہو اس کا بیمار کوئی
ساقی نے عجب بات کہی رندوں سے　　پینے سے نہیں ہوتا مے خوار کوئی

❁❁❁

یہ گردِ ہوس جھاڑ دو مے خانے میں　　دامانِ خرد پھاڑ دو مے خانے میں
ساقی کے اگر سچے طلب گار ہو تم　　ہمت کے قدم گاڑ دو مے خانے میں

❁❁❁

بن اس کی زباں اس کا تکلم ہو جا　　اس ذات کی وسعت میں تو گم ہو جا
ہے منزلِ مقصود اسی میں پنہاں　　ساقی کے سمندر کا تلاطم ہو جا

❁❁❁

یہ بیش یہ کم یکساں ہیں میرے لئے　　خوشیاں ہوں کہ غم یکساں ہیں میرے لئے
کس موڑ پہ آپہنچا ہوں میں ساقی　　یہ مدح یہ ذم یکساں ہیں میرے لئے

❁❁❁

صدمات کی تابشوں سے ڈر جاتے ہیں　　آفتاب کی بارشوں سے ڈر جاتے ہیں
جھیلا ہے عذاب اس لئے ہم ساقی　　حالات کی سازشوں سے ڈر جاتے ہیں

❁❁❁

ویسے تو یہ اکڑ رہی ہے ساقی　　حالت لیکن بگڑ رہی ہے ساقی
اب تو ہی نکال اس کے بسنے کی سبیل　　تیری دنیا اجڑ رہی ہے ساقی

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر قمر رئیس بہرائچی

339, Bari Hatt, Bahraich 271801 (U.P.)

رباعیات

اجداد سے پایا جو وتیرہ میں نے — تا عمر اسے ذہن میں رکھا میں نے
ہونٹوں پر تشنگی مچلتی ہی رہی — دیکھا نہ مگر جانب دریا میں نے

❁❁❁

دنیا میں پلٹ کے کب بشر آیا ہے — تعزیر کچھ ایسی تھی اِدھر آیا ہے
جنت میں جو پہنچا تو فرشتوں نے کہا — بھٹکا ہوا انسان تھا گھر آیا ہے

❁❁❁

ہرگز نہ کرو وقت یہ اپنا ضائع — اک پل بھی کرو نہ تم خدا را ضائع
ناراض ہوا جس دن بھی وقت قمر — ہو جائے گی اس دن یہ دنیا ضائع

❁❁❁

حق بات کو کہنے سے مجبور ہے آج — سچائی سے انسان بہت دور ہے آج
معبود کی مرضی نہیں ہے اس میں قمر — انسان اپنے عمل سے رنجور ہے آج

❁❁❁

مفلس کیا زر دار نہیں پڑھتے ہیں — عالم اور فنکار نہیں پڑھتے ہیں
کیسے عاشق ہیں یہ اردو والے — اردو کا اخبار نہیں پڑھتے ہیں

❁❁❁

سوداؔ کی رباعی پہ لکھوں میں تقریظ — اس جادو بیانی پہ لکھوں میں تقریظ
سورج کو چراغ میں دکھا دوں ، لیکن — قبل اپنی گدائی پہ لکھوں میں تقریظ

❁❁❁

جب تک ہے جسم میں لہو سچ بولو — حاکم ، ظالم ، کے رو برو سچ بولو
سچ ہی سے زندگی سنورتی ہے قمر — وہ دوست ہو اپنا کہ عدو سچ بولو

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

رباعیات

محسن باعشن حسرتؔ

4, Princep Street, 1st Floor, Kolkata 700072

اخلاص کا سینے میں خزینہ رکھئے
دل میں نہ کوئی بغض ، نہ کینہ رکھئے
آندھی سے عداوت کی بچا کر خود کو
محفوظ محبت کا سفینہ رکھئے

❁❁❁

کیا اس کے سوا اور ہوا دے گی میاں
شاخوں سے ہر اک پتہ گرا دے گی میاں
آندھی نئی تہذیب کی اٹھی جو کبھی
اخلاص کی دیوار ہی ڈھا دے گی میاں

❁❁❁

حق بات جو بے خوف کہا کرتے ہیں
کب ڈر کے کسی سے وہ رہا کرتے ہیں
زنجیر کی پروا نہ انہیں زنداں کی
ہنستے ہوئے سولی پہ چڑھا کرتے ہیں

❁❁❁

عظمت کی تمنا ہے نہ زر مانگے ہے
پھولوں کی نہ خواہش نہ ثمر مانگے ہے
سب مل کے جہاں پیار ، محبت سے رہیں
دل میرا بس اک ایسا ہی گھر مانگے ہے

❁❁❁

مامون ایمنؔ

20, Biscayne Drive, Huntington, Ny 11743 U.S.A

موہوم حقیقت سے مفر ہے ہستی
بن مانگی دعاؤں کا اثر ہے ہستی
آ جائے اگر پیش قدم کو مشکل
رستہ میں کبھی زیر ، زبر ہے ہستی

❁❁❁

شاخوں کے لئے سبز شجر ہے ہستی
کانٹا ہے کہیں پھول ، ثمر ہے ہستی
دیکھیں تو اِدھر جان کا تحفہ بے شک
سوچیں تو حسیں موت اُدھر ہے ہستی

❁❁❁

وجدان کی دیوار ہے ، ڈر ہے ہستی
جرأت کا سراپا ہے ، خطر ہے ہستی
کھلتا ہے نہیں راز شناسائی کا
قسمت پہ جمی برف ، شرر ہے ہستی

❁❁❁

آنکھوں میں کبھی شام ، سحر ہے ہستی
کرنوں کی ادا ، خاک بہ سر ہے ہستی
افلاک بھی جھک جاتے ہیں اس کے آگے
تخئیل کا ہر بحر ہے ، بر ہے ہستی

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

رباعیات

سمیع احمد صدیقی

I-92, Rameshwarpur Road, Mitia Bridge, Kolkata 700024

مظلوم کی چیخوں کو ترانہ سمجھے
ہر تازہ حقیقت کو فسانہ سمجھے
انساں کی مصیبت کا سمجھنا مشکل
بس اب تو زمانے کو زمانہ سمجھے

❁❁❁

کچھ لے کے نہیں آئے ہیں آنے والے
کچھ لے کے نہیں جائیں گے جانے والے
لیکن ہے ہوس دولت و شہرت کی بہت
انجام سے غافل ہیں زمانے والے

❁❁❁

پھولوں کی مہک اہل چمن سے پوچھو
موسم کی فضا سرو سمن سے پوچھو
فردوس مرا خاک وطن ہے یارو
یہ ہم سے نہیں ارضِ وطن سے پوچھو

❁❁❁

جو بچ کے تشدد سے گزر جائیں گے
نام اپنا زمانے میں وہ کر جائیں گے
ہو عزم تو مل جائے گی منزل بھی انہیں
بگڑے ہوئے حالات سنور جائیں گے

❁❁❁

ڈاکٹر اعجاز مانپوری

Khanquah-e-Quadria, Manpur Jora Masjid
P.o. Buniyadganj, Dist Gaya 823003

ہاتھوں کی لکیروں پہ بھروسہ مت کر
خوابیدہ سرابوں پہ بسیرا مت کر
جس سے کہ ہو تصویر انا بھی دھندلی
تو دامن کردار کو ایسا مت کر

❁❁❁

دکھ درد نہ بانٹے گی ، نہ کچھ بولے گی
دنیا بڑی ظالم ہے ، نہ منھ کھولے گی
ہر آن غریبی پہ ہنسے گی ، بلکہ
خوشیوں پہ تیری زہر سدا گھولے گی

❁❁❁

احساس جو زندہ ہے تو انساں زندہ
مردہ ہوا احساس تو حیواں زندہ
تدبیر سے تقدیر بدل سکتی ہے
رکھنا ہے تو رکھ قوتِ ایماں زندہ

❁❁❁

حالات بدلتے ہیں ، بدل جائیں گے
دکھ درد کے موسم بھی نکل جائیں گے
ایثار و محبت کی تمازت ہو تو
پتھر بھی کسی روز پگھل جائیں گے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

رباعیات

اصغر ویلوری

No. 28 (12), Kumaran Nagar
Chennai 600082 (Mob. 9884989600)

ہمدردیاں وہ مجھ پہ جتائیں تو کہوں
جانب مری اک بار وہ آئیں تو کہوں
غیرت بھی کوئی چیز ہے غم سے بڑھ کر
وہ بات اگر میری اٹھائیں تو کہوں

❁❁❁

صورت سے بڑی ماہ جبیں لگتی ہے
کچھ کوئی کمی اور نہیں لگتی ہے
تیز آنکھیں بھی کھا جاتی ہیں دھوکہ اکثر
ہے دور تو ، ہر چیز حسیں لگتی ہے

❁❁❁

غم اور بڑھانے کے لئے مت آنا
آئے ہو تو جانے کے لئے مت آنا
آنا تو مرے زخم کا مرہم بن کر
تم آگ لگانے کے لئے مت آنا

❁❁❁

تم پیار جگاؤ تو کوئی بات ہوئی
نفرت کو مٹاؤ تو کوئی بات ہوئی
چہروں کو جلانا تو بڑا کام نہیں
اک شمع جلاؤ تو کوئی بات ہوئی

❁❁❁

اشرف یعقوبی

C/o Dr. Nawab Ashraf 6/2/H/1, K.B. Ist Lane
Kolkata 700011

جو کھل کے برستا نہیں بادل کیسا
بے وجہ جو ہنستا نہیں پاگل کیسا
جس شئے کی جو خوبی ہے ظاہر بھی تو ہو
ماتھے پہ جو نہ چمکے وہ صندل کیسا

❁❁❁

عورت جسے کہتے ہیں حیا کی دیوی
مریم کی طرح ہو ، وہ سیتا جیسی
منھ دیکھنا پڑ جائے نہ بدنامی کا
اللہ کسی کو نہ دے ایسی بیٹی

❁❁❁

ہے نیک عمل ، نیک طبیعت اپنی
مانا کہ بہت کم ہے عبادت اپنی
لیکن یہ ہے امید خدا سے اشرف
مجھ پر بھی خدا بھیجے گا رحمت اپنی

❁❁❁

رکھتا ہے دل میں وہ نفرت کے خار
میں پھر بھی اس بت سے کرتا ہوں پیار
ہے اس کا انداز بھی واللہ غضب
ہاں کے پردے میں ہو جیسے انکار

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

وفیات

پروفیسر عبدالمنان طرزی
Mohalla Faizullah Khan, Darbhanga

قطعات تاریخ وفات

ندا فاضلی

وہ مخدوم و مرشد کہ صوفی ولی ہیں
خدا کی ہی رحمت کے طالب سبھی ہیں
انہیں رحمت حق ہے یوں کام آئی
''بہشت بریں و ندا فاضلی ہیں''
2016ء

مولانا اکمل یزدانی

کس طرف ڈھونڈیں انہیں پائیں کہاں
دل میں رہ کر اب ہیں آنکھوں سے نہاں
اکملِ یزدانی بھی رخصت ہوئے
1501
ہائے یہ جورِ فلک اک الاماں
514 + 1501 =2015

انور سدید

ناقد اک ممتاز تھے انور سدید
فن کو کیا کچھ دے گئے انور سدید
پائیں وہ جنت خدائے پاک سے
1235
دارِ فانی سے گئے انور سدید
1235 + 781 =2016

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

بہ لطف خدا و بفضل الٰہ
یہاں بھی وہ تھے صاحب عز و جاہ
بہ حکم الٰہی ہیں فردوس میں
631
ملک زادہ منظور احمد بھی واہ
1385 + 631 =2016

انتظار حسین

وقار پاگیا اُن سے جہانِ افسانہ
نئی جہات اس میں لائے انتظار حسین
خدائے پاک کی رحمت سے فیض پا جائیں
کہانی کار بھی اب ہائے انتظار حسین
2016ء

جوگندر پال

رقص کرتا تھا زبان خامہ پر جس کے جمال
ناقدوں نے بھی کیا تسلیم جس کو باکمال
لوکہانی کار دنیا سے اب اک اعلیٰ گیا
643
آبروئے فن افسانہ شری جوگیندر پال
1373 + 643 =2016

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

کتابوں کی دنیا

نام کتاب: چاندنی خیالوں کی
مصنف : صدر عالم گوہر
ناشر : کہکشاں پبلی کیشن، ممبئی
اشاعت : ۲۰۱۵ء صفحات : ۱۹۲
قیمت : ۲۰۰ روپے مبصر : ڈاکٹر حسن رضا

''شاعری چیزے دیگر است اور فن غزل چیزے دیگر ترین۔''

یہ کلیدی جملہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ شاعری بالعموم اور غزل گوئی بالخصوص کچھ اجزائے لاینفک کی حامل ہوتی ہے اور ان اجزا کو منجملہ ارکانِ شاعری اور شعریت کے زمروں میں زمرہ بند کیا جاسکتا ہے، مگر عہد حاضر کی شاعری میں یہ دونوں اجزا باہم تحلیل خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ کہیں ارکان شاعری سے احتراز یا بے نیازی ملتی ہے تو کہیں شعریت سے عاری شاعری نظر آتی ہے۔ فنی ہمہ جہتی کے اعتبار سے قحط الرجالی کے اس عالم میں جب کوئی شعری مجموعہ فنی اوصاف سے آراستہ نظر آتا ہے تو دل کو طمانیت اور ذوق کو یک گونہ تسکین حاصل ہوتی ہے۔

''چاندنی خیالوں کی'' سرسٹھ غزلوں پر مشتمل صدر عالم گوہر کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ ادبی روایت کے مطابق مجموعہ مذکور کا آغاز حمد سے ہوتا ہے جس میں آٹھ اشعار ہیں اور یہ غزل کی تکنیک پر لکھی گئی ہے۔

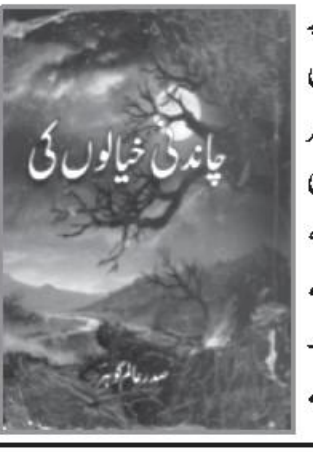

اس کے بعد پانچ اشعار پر مشتمل نعت ہے۔ یہ بھی غزل کی ہیئت میں ہے۔ گوہر سرزمین بہار ضلع مدھوبنی (پرسولیا) سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ایک مدت سے ممبئی کے بھیونڈی میں متمکن ہیں۔ ان کے تعارفی خاکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گیارہ زبانوں کے آشنا ہیں، مگر تخلیق وتصنیف اور ترجمے کے نمونے اردو، ہندی اور میتھلی زبانوں میں ہی ملتے ہیں۔ ان کا رشتہ صحافت اور ادب دونوں سے استوار ہے۔ صحافت سے ان کا پیشہ ورانہ تعلق ہے، جب کہ ادب سے ان کا سخن ورانہ رشتہ ہے۔ صدر عالم گوہر کی شخصیت بڑی ہمہ جہت ہے۔ وہ بیک وقت صحافی، مصنف، مؤلف، مترجم، محقق، نقاد اور غزل نگار ہیں۔ شاعری میں انہیں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظم اور دوہے سے بھی شغف ہے۔ انہوں نے اپنے تئیں سنسکرت کے سبھی نورسوں کو برتنے کی سعی کی ہے، مگر پریم رس ان کے یہاں غالب نظر آتا ہے۔ چنانچہ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے تحت انہوں نے ان لفظوں میں اظہار ادعا کیا ہے:

> ''میں نے کوشش کی ہے کہ 'سب رس' یعنی سارے کے سارے نورسوں کا استعمال اپنی شاعری میں کروں، اپنی غزلوں میں کروں اور زندگی کو ہر زاویے سے دیکھوں۔ حالاں کہ اس میں محبت کا رنگ ہی زیادہ نکھر آیا ہے، کیوں کہ یہ ساری دنیا محبت ہی کے گرد گھومتی ہے۔''

پیش نظر مجموعہ میں ابتدائی دور کی غزلیں ہیں، لہٰذا ان میں فطری طور سے مشاطگی فن مفقود نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ان غزلوں پر ہندی کے بھی گہرے اثرات ہیں، بنابریں ان میں غزل کا وہ ڈکشن نہیں ہے جس کے حسن استعمال سے فطری جاذبیت، شیرینیت اور غنائیت پیدا ہوتی ہے۔ سندر ہے کہ شاعری ارکان وبحور کے سانچے میں لفظوں کو فٹ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ اور خیالات کو باہم سیال نامی شئے بنا کر انڈیلنے کا نام ہے۔ گوہر کا یہ اعتراف اس ضمن میں قابل توجہ ہے:

> ''میں یہ نہیں کہتا کہ میری شاعری اعلیٰ پایہ کی ہے (پھر بھی) اگر اس مجموعہ کا ایک شعر بھی لوگوں کو پسند آجائے تو میں سمجھوں گا کہ میری کاوش، میرا رت جگا کامیاب ہوگیا۔''

خیر! اعتراف، ایقان اور ادعا کا اظہار ادبی روش کا غماز ہے۔ کہیں یہ

PDF Compressor Free Version

تعلّی کی صورت میں نظر آتا ہے تو کہیں عاجزی وخاکساری کی شکل میں، اس کی شہادت وثبوت تو اس کی تخلیق اور تخلیقی رویہ ہی قاری، مبصر اور نقاد کو فراہم کرنا ہے، لہٰذا میں ایسے اشعار بطورِ نمونہ پیش کررہا ہوں جس میں گوہر کا ''سب رس'' اور ''سب رنگ'' اپنی جھلکیاں دکھا جائے۔

سب کو دشمن بنا لیا میں نے
بولنا سچ شروع کیا میں نے

کس کو سمجھاتا ہے، کس کو بہلاتا ہے، عمر ہے مختصر
وقت یوں نہ گنوا، بات میں نہ بھلا، خود کو ایسے نہ چھل

چاند سب کو تو ملتا نہیں
دور ہی سے نہارنے چلئے

ہو نازنیں زمیں کی یا پری ہو آسماں کی
حسیں کو اور بھی حسیں بنا رہی ہے چاندنی

اک شہنشاہ سے تاج بخوا دیا
وہ بھی کیا چیز تھی بس یہی چاندنی

تونے جو چھو دیا ہے اسے
ہوگئی ہے یہ پاگل پون

پھول کو ہنسنا، کلی کو مسکرانا آگیا
آپ کیا آئے بہاروں کا زمانہ آگیا

ہزاروں نام میرے ہر طرف ہیں
تمہارا نام قسمت میں نہیں ہے

حال پر اپنے ہنسی اب آرہی ہے
رنگ کیا کیا زندگی دکھلا رہی ہے

اب میں یہ قاری سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ خود بقیہ رنگوں سے اپنی آنکھوں میں رنگ اتاریں اور مختلف رسوں کو جمِ قلب میں گھول کر دیدہ و دل کو بالترتیب رنگ آمیز اور رس دار بنائیں۔ اس مجموعہ میں شامل فاضلی کے پیش لفظ اور رفیع انصاری کے ''دیباچہ'' نے گوہر کی غزل گوئی کے خصائص کو خوبصورت اور معنی خیز اشاریوں میں پیش کردیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک لائق مطالعہ شعری مجموعہ ہے، اسے اہتمام سے چھاپا گیا ہے اور اسے بازار میں لاتے ہوئے عام قاری کی قوت خرید کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

نام کتاب: کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے
مصنف : احمد صغیر
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
اشاعت : ۲۰۱۵ء صفحات : ۱۸۰
قیمت : ۲۵۰روپے مبصر : ڈاکٹر نزہت پروین

احمد صغیر کے چار افسانوی مجموعے ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' (۱۹۹۵ء) ''انا کو آنے دو'' (۲۰۰۱ء) ''درمیان کوئی تو ہے'' (۲۰۰۷ء) ''داغ داغ زندگی'' (۲۰۱۳ء) میں تیرہ افسانے دلت مسائل کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ ان تیرہ افسانوں کا انتخاب زیرِ نظر کتاب ''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے'' میں کیا گیا ہے۔ یہ تیرہ افسانے ہیں ''انا کو آنے دو''، ''تعفن''، ''ڈوبتا ابھرتا ساحل''، ''پیاسی ہے زمیں پیاسا آسماں''، ''پناہ گاہ''، ''اوورٹائم''، ''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے''، ''بے پناہ جنگل اور وجود''، ''سفر ابھی ختم نہیں ہوا''، ''فصیلِ شب میں جاگتا ہے کوئی''، ''ڈوبتا ابھرتا ساحل''، ''میں دامنی نہیں ہوں''، ''شدھی کرن'' اور ''آگ ابھی باقی ہے''۔

''انا کو آنے دو'' نکسلی تحریک پر لکھا گیا صغیر احمد کا مشہور افسانہ ہے، جس میں انا نام کا ایک کردار سماج کو بدلنے کا بیڑا اٹھاتا ہے اور جہاں بھی غریبوں، دبے کچلے لوگوں پر ظلم ہوتا ہے، یہ پہنچ جاتا ہے اور عوام کو اکٹھا کر کے ظالم کا خاتمہ کرتا ہے۔ افسانہ ایک گاؤں سے شروع ہوتا ہے جہاں دہشت گردوں نے غریبوں پر ظلم ڈھایا ہے۔ ان کے گھروں کو جلا دیا ہے اور کئی لوگ مارے گئے ہیں۔ اس افسانے کا ایک اہم کردار پھلمتیا ہے جو تمام واقعات کی چشم دید گواہ ہے۔ یہ واقعہ اور پچھلے تمام واقعات کو وہ اپنی آنکھوں میں بسائے اس وقت کا انتظار کررہی ہے جب انا لوٹ آئے گا اور حساب برابر کردے گا۔

PDF Compressor Free Version

اس افسانہ کو سمجھنے کے لئے نکسلی تحریک کے اصول و ضوابط اور طور طریقوں کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ یہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ٹیبل پر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ گاؤں میں جا کر تحریک سے جڑے لوگوں کے بیچ میں رہ کر قلم بند کیا گیا ہے۔ دو تین مثالیں میں پیش کرنا چاہوں گی جس سے آپ کو بھی اندازہ ہو جائے گا۔

(۱) اس طرح کی تنظیم سے جڑے لوگ جو قیادت سنبھالتے ہیں، اسے ہول ٹائمر کہتے ہیں۔ وہ اپنا پورا وقت پارٹی کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی کچھ نہیں ہوتی۔ وہ صرف عوام کے لئے جیتے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھئے: ''اور انا گاؤں کا ہر دلعزیز ساتھی بنتا چلا گیا، نئی نئی باتیں ظہور میں آنے لگیں۔ انا سارا سارا دن گاؤں گاؤں پھرتا رہتا۔ اس کا دماغ ہمیشہ نئی نئی باتیں سوچتا رہتا۔ پاؤں کی گردش بدستور جاری رہتی، معمولی معمولی بات پر وہ طوفان برپا کر دیتا جس کے باعث دوسرے لوگوں میں بھی احتجاج کی قوت بڑھ گئی تھی۔ بے چینی، قلبی بے چینی سلگ اٹھی تھی۔ نہ جانے کب کہاں انا آپہ نچے اور.....'' (افسانہ ''انا کو آنے دو'' ص ۹)

(۲) اس طرح کی تحریک سے جڑے لوگ اپنے پروگرام کے بارے میں عام لوگوں کو نہیں بتاتے۔ کس گاؤں میں، کس کے گھر رات گزارنی ہے، پارٹی میں قیادت کرنے والے ہی طے کرتے ہیں۔ جس پر ان کو اعتماد ہوتا ہے اسی کے گھر رات گزارتے ہیں اور صبح ہونے سے پہلے ہی وہ گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھئے: ''.....شام ہونے کو آئی تھی، دھوپ نڈھال سی آنگن سے رخصت ہو رہی تھی۔ جیسے ہی پھلمتیا نے گھر میں قدم رکھا۔ انا کو چارپائی پر بیٹھا پایا۔ وہ حیرت زدہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی، اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انا اور اس کے گھر.....؟ 'آج ہم رات یہیں گزاریں گے، صبح ایک مہم پر جانا ہے باقی ساتھی پیچھے سے آ رہے ہیں.....' انا نے اسے اطلاع دی۔'' (افسانہ ''انا کو آنے دو'' ص ۱۰)

(۳) اس طرح کی تحریک سے جڑے لوگ اکیلے کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔ وہ جو بھی قدم اٹھاتے ہیں اس میں عوام کی مرضی شامل ہوتی ہے، اس لئے کوئی بھی مسئلہ جب سامنے آتا ہے تو قیادت کرنے والے لوگ ''جن عدالت'' لگا کر عوام کو اکٹھا کرتے ہیں اور اس مسئلے پر ان کی رائے جاننا چاہتے ہیں اور جب اکثریت کوئی فیصلہ لے لیتی ہے تو پھر اس کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ یہ اقتباس غور فرمایئے: ''بھاشن دیتا تو چہرہ کیسا سرخ ہو جاتا۔ وہ کیا کیا کہتا تھا۔ سب بات تو پھلمتیا کی سمجھ میں نہ آتی، مگر کچھ جملے کہیں کہیں سے اس کو یاد تھے۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا..... یہ ساری ویوستھا سڑی گلی ہے، جس محکمے میں جایئے وہاں رشوت اور بھرشٹا چار پنپ رہا ہے۔ ہر کوئی ہاتھ میں بھیک کا پیالہ لئے بیٹھا ہے اور ہم لوگ بھی اس کے پیالے میں کچھ نہ کچھ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہمیں یہ عادت بدلنی پڑے گی..... تقریر ختم ہو گئی۔ چند جوشیلے نوجوانوں نے انا کو گود میں اٹھا لیا .....کامریڈ انا کو لال سلام..... لال سلام، لال سلام!..... بڑا جوشیلا اور بدن میں خون کی رفتار کو تیز کر دینے والا منظر تھا۔ پھلمتیا مجمع سے کنارے کھڑی سوچ رہی تھی..... آج کسی آفیسر کی ضرور شامت آنے والی ہے۔'' (افسانہ ''انا کو آنے دو'' ص ۱۲)

ظاہر ہے یہ افسانہ معمولی افسانہ نہیں ہے۔ اس کے ایک ایک جملے اپنے اندر کئی معنی چھپائے ہوئے ہیں۔ اتنا گٹھا ہوا افسانہ ہے کہ ایک ایک پیراگراف کے اندر ایک ایک کہانی پوشیدہ ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ دبے کچلے لوگ، مظلوم لوگ اس تحریک سے جڑے ہوئے ہیں۔ انصاف کے لئے عدالت کے کئی سالوں تک چکر لگانے پڑتے ہیں، پولس کی زیادتیاں سہنی پڑتی ہیں، اس کے باوجود انصاف نہیں ملتا، لیکن جب اس طرح کی تحریک سے جڑے لوگوں کے پاس اپنی فریاد لے کر جاتے ہیں تو بغیر وقت گنوائے اور بغیر روپے خرچ کئے ان کو انصاف مل جاتا ہے، ان کے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غریب اور مظلوم لوگ اس

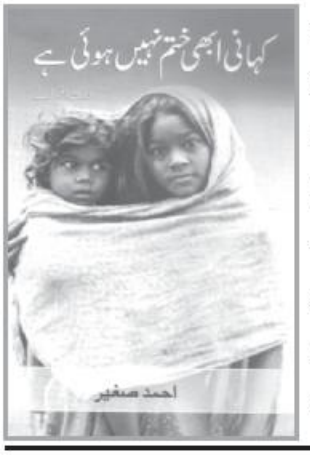

PDF Compressor Free Version

تحریک سے جڑے ہوئے ہیں، لیکن مصنف نے ایک اہم سوال اس افسانہ میں اٹھایا ہے کہ یہ بہاؤ کہاں جا کر تھمے گا:

''کیا اکیلا کوئی انا اس نظام کو بدل دے گا یا ہر گھر میں ایک انا کا وجود لازمی ہے؟ ہر گاؤں، ہر قصبے اور ہر گھر میں انا کی ضرورت ہے جو موجودہ نظام کو بدلنے میں معاون ہو سکے، لیکن اس قدر انا آئے گا کہاں سے؟ برسوں میں صرف ایک انا پیدا ہوتا ہے اور بس ایک دن میں اسے ختم کر دیا جاتا ہے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے..... تو کیا ہر ماں کو ایک انا.....؟'' (افسانہ ''انا کو آنے دو'' ص ۱۳)

پھلمتیا اس افسانے کے مرکز میں ہے۔ انا کے بعد اس کا کردار سب سے مضبوط کردار ہے کیونکہ پورا افسانہ اسی کے ارد گرد گھومتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پھلمتیا اتنا بڑا حادثہ ہونے کے بعد بھی ٹوٹتی نہیں ہے، اس کا حوصلہ بلند ہے اور اسے پتہ ہے کہ جب انا جیل سے چھوٹ کر آئے گا تو کیا انجام ہوگا۔ افسانے کا اختتام ملاحظہ فرمایئے:

''پھلمتیا یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ دھیرے دھیرے واپس جاتی جیپ پر بیٹھے دو شخص جلے مکانات کو تمسخر سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے..... بڑے نکسلائٹ بنتے ہیں سالے، ایک ہی رات میں ٹھنڈے پڑ گئے۔''

پھلمتیا اچانک سلگ اٹھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور چلا کر بولی:

انا کو آنے دو سالو پتہ چل جائے گا..... پھلمتیا کی آواز ٹھنڈا کرنے والوں تک پہونچی یا نہیں، لیکن وقت کے گنبد میں اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ انا کو آنے دو .....انا کو آنے دو!'' (افسانہ ''انا کو آنے دو'' ص ۱۳)

یہ افسانہ اس لئے غیر معمولی ہو جاتا ہے کہ اس میں جو کردار پیش کئے گئے ہیں، وہ دبے کچلے اور دلت سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے انا، پھلمتیا، کاروِ مستری، لکھیا وغیرہ۔ لکھیا کا کردار بالکل مختصر سا ہے، لیکن اس کی وجہ سے کہانی میں ایک ایسا واقعہ سامنے آتا ہے جو کہانی کے دھارے کو ایک نیا موڑ دیتا ہے۔ لکھیا جو بابو صاحب کی حویلی میں برتن مانجنے کا کام کرتی تھی، حمل سے رہ گئی تھی۔ بہت پوچھے جانے پر اس نے بابو صاحب کا نام بتا دیا، پھر کیا تھا انا نے دو سو آدمیوں کے ساتھ بابو صاحب کی حویلی پر حملہ کر دیا، گویا حویلی کی دیواریں ہل کر رہ گئیں۔

''آگ ابھی باقی ہے'' ایک مختصر سا افسانہ ہے جس میں ایک دلت لڑکی کنتی اور ایک امیر فیملی مسز شرما کی کہانی ہے۔ ڈاکٹر دیپک شرما جب چھٹی میں اپنے گاؤں جاتے ہیں تو کنتی کو ساتھ لے کر دلی آجاتے ہیں۔ کنتی کی ماں ڈاکٹر دیپک شرما کے گاؤں میں بنی حویلی میں جھاڑو پونچھے کا کام کرتی تھی۔ یہ لوگ ہمیشہ اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔ کنتی کی بڑی بہن پارو کی شادی میں دس ہزار روپیہ کی مدد کی تھی، اس لئے کنتی کی ماں نے کنتی کو ان کے ساتھ دلی بھیج دیا۔ جب سے کنتی دلی آئی تھی تو دن بھر کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی رہتی۔ کنتی پر اتنے ظلم ہوتے ہیں کہ وہ اس زندگی سے عاجز آجاتی ہے، لیکن اس کے پیر میں زنجیر پڑی تھی۔ اگر وہاں سے بھاگتی تو ممکن تھا چوری کا الزام لگا کر جیل میں ڈال دیا جاتا۔ گاؤں واپس جا نہیں سکتی تھی، کیونکہ ڈاکٹر دیپک شرما نے روپیہ دے کر احسان کی رسی میں جکڑ رکھا تھا، لیکن ایک دن جب کنتی کی طبیعت خراب تھی اور مسز شرما اس سے کام پر کام لئے جا رہی تھیں اور گالی بھی دیئے جا رہی تھیں تو کنتی آپے سے باہر ہو گئی:

''کنتی پلٹی، اس نے مسز شرما کے تیور کو دیکھا۔ وہ غصے سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ آج پھر اس کی پٹائی ہونے والی ہے۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی، نہ جانے اس کے اندر کہاں سے اتنی جرأت پیدا ہو گئی کہ مسز شرما کے قریب پہونچتے ہی ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا۔ مسز شرما لڑکھڑا کر گر پڑیں، اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتیں کنتی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔''

(افسانہ ''آگ ابھی باقی ہے'' ص ۱۲۳)

اس افسانے میں بھی ایک عورت کا احتجاج ہے کہ جب ظلم حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے، برداشت کی قوت جواب دے جاتی ہے تو مظلوم یہ نہیں سوچتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس کے سامنے جو صورتحال پیدا ہوتی ہے، اس سے وہ نکلنا چاہتا ہے۔ یہ افسانہ جہاں ختم ہوتا ہے۔ وہاں سے ایک

PDF Compressor Free Version

نیا افسانہ شروع ہوتا ہے کہ کتنی کا انجام کیا ہوا۔ احمد صغیر کا کمال یہی ہے کہ وہ ہر افسانے کے اختتام پر یا تو ایک نئی کہانی چھوڑ جاتے ہیں یا قاری کے سامنے ایک سوال کھڑا کر دیتے ہیں اور قاری دوسری کہانی کا تانا بانا اپنے دماغ میں بننے لگتا ہے یا سوال کا جواب خود تلاش کرنے لگتا ہے۔

احمد صغیر کے یہ تیرہ افسانے مختلف موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ جہاں اس میں انا جیسا مضبوط کردار ہے جو سماج کو بدلنے کے درپے ہے، وہیں افسانہ ''تعفن'' کا منوابدبو میں ہی اپنی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ خوشبو اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی، ایک داتون بیچنے والی سگنی کی زندگی بچکولے لیتی رہتی ہے اور ایک دن اسے ساحل مل جاتا ہے۔ ایک بھکارن سگنیا کی عزت کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی، وہیں دکاس اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود بھی ہریجن ہی سمجھا جاتا ہے اور مندر میں داخلے کے بعد مندر کو گنگا جل سے دھویا جاتا ہے۔

احمد صغیر کا ہر افسانہ اپنے اندر احتجاج رکھتا ہے اور سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔ احمد صغیر کا دل دردمند ہے اس لئے اس کے دل میں غریبوں، دبے کچلے اور پسماندہ طبقے کے لئے ہمدردی ہے۔ احمد صغیر اپنے افسانے کے ذریعہ اس طبقے کو اوپر اٹھانا چاہتے ہیں یا ان کو آئینہ دکھانا چاہتے ہیں کہ تمہاری زندگی، تمہاری شخصیت، تمہارا وجود یہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس طبقے میں تبدیلی آئے، اس لئے انہیں تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ تعلیم کے بغیر نہ ہی کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ کوئی انقلاب آسکتا ہے۔

نام کتاب: حدوں سے آگے
مصنف : ڈاکٹر محمد مستمر
ناشر : تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی
اشاعت : ۲۰۱۵ء صفحات : ۱۶۰
قیمت : ۱۶۰ روپے مبصر : ڈاکٹر قیصر زاہدی

ڈاکٹر محمد مستمر کا افسانوی سفر زیادہ طویل نہیں ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ''شاخ مرجھا گئی'' ہریانہ اردو اکادمی کے جریدہ ''جمنا تٹ'' میں ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا تھا، پھر وقتاً فوقتاً ان کے افسانے اردو کے ادبی و نیم ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو کر باذوق قارئین سے داد و تحسین کے مستحق بھی بنے اور مقبول عام بھی ہوئے۔

''حدوں سے آگے'' ڈاکٹر محمد مستمر کے دس افسانوں پر مشتمل ان کا اولین افسانوی مجموعہ ہے یہ افسانے خالص بیانیہ انداز میں تحریر کئے گئے ہیں۔ عام فہم اور سلیس زبان میں ہونے کی وجہ کر ان افسانوں کے مطالعہ سے قاری کا ذہن نہ تو بوجھل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کوفت محسوس کرتا ہے، بلکہ خوش دلی سے اول تا آخر آسانی کے ساتھ وہ ان افسانوں کا مطالعہ کر جاتا ہے اور ایک ذہنی آسودگی سے بھی ہمکنار ہوتا ہے۔

اس افسانوی مجموعہ میں شامل افسانوں کے موضوع اور مزاج ایک دوسرے سے نہ صرف یہ کہ مختلف ہیں بلکہ متنوع تجربوں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ مثلاً افسانہ ''چولا'' میں رومانی رنگ کا غلبہ ہے تو ''قدموں کے نشان'' اور ''کل جگ میں'' فکر انگیز عناصر کی فراوانی ہے۔

مستمر کے افسانوں کے کردار اسی سرزمین، سماج اور ماحول و معاشرے کی پیداوار اور اسی کے پروردہ ہیں جن سے کوئی بھی حساس فرد چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ مستمر اپنے افسانوں کے کردار بالکل حقیقی پیکر میں پیش کرتے ہیں۔ وہ ان پر رنگ و روغن اور ملمع سازی سے گریز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے کردار قاری کے روبہ رو حقیقی پیراہن میں جلوہ فگن ہوتے اور ان کے دل و دماغ میں ایک خاص مقام بنا لیتے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں ''تحریک''، ''قدموں کے نشاں'' اور ''میرا قصور'' وغیرہ کا شمار کامیاب افسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔

ماہرین نفسیات کا قول ہے کہ مردوں کے بہ نسبت خواتین کے رویے (Attitude) میں آسانی سے تبدیلی آجاتی ہے۔ افسانہ ''تحریک'' اسی قول پر مبنی ہے اور افسانے کی مرکزی کردار کامنی پر یہ قول صادق آتا ہے،

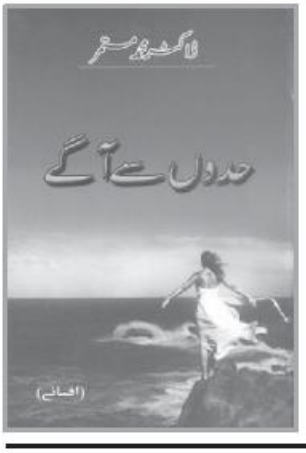

''قدموں کے نشاں'' مستمر کا ایک خوبصورت افسانہ ہے اس کے توسط سے انہوں نے محکمہ تعلیم اور تعلیمی نظام میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کو

PDF Compressor Free Version

بے نقاب کرنے کی سعی کی ہے۔ مثلاً نصاب کی تیاری میں بے ضابطگی، ٹوڈے میل یعنی ظہریہ طعام میں لوٹ کھسوٹ وغیرہ، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ سچائی، ایمانداری اور آدرشوں پر چلنے والے عملے کو کئی قسم کی پریشانیوں سے گزرنا پڑتا ہے، مگر فرض شناس شخص ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔

نائشل افسانہ ''حدوں سے آگے'' بھی ایک عمدہ افسانہ ہے اس میں مصنف نے الٹرا موڈرن خاندان میں در آتی کثافتوں اور برائیوں کو بے نقاب کرنے کی سعی کی ہے، مگر افسانے کا اختتام جو انہوں نے پیش کیا ہے وہ حقیقت کے قریب نہیں ہے۔ اس قسم کا نتیجہ کب پیش آتا ہے، شاید انہیں اس کی جانکاری نہیں۔ اس افسانے میں سب سے چونکانے والی بات تو یہ ہے کہ محض چند دنوں کا کتے کا پلا جس کی ابھی ٹھیک طرح سے آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں، اسے یہ کیسے پتا چلا کہ اس کی ماں اب تک کئی بار بیائی تھی اور کل ملا کر اب تک پندرہ بچوں کو جنم دے چکی ہے؟

اس مجموعے میں شامل بعض افسانوں کے مکالمے اور جزئیات نگاری میں بے حد طوالت اور بعض جگہ جملوں کی تکرار کی وجہ کر افسانے کا حسن مجروح ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی بعض افسانوں میں جملوں کی ساخت بھی توجہ طلب ہے۔

نام کتاب: علاقائی زبانوں کی کہانیاں
مترجم : ڈاکٹر بانو سرتاج
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
اشاعت : ۲۰۱۵ء صفحات: ۳۶۰
قیمت : ۳۹۹ روپے مبصر : ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ

ڈاکٹر بانو سرتاج اردو اور ہندی کی مشہور ادیبہ ہیں۔ انہوں نے بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے لکھا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اردو اور ہندی سے واقفیت کے ساتھ ساتھ مراٹھی اور انگریزی زبان وادب پر بھی انہیں دسترس حاصل ہے۔ ترجمہ نگاری کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ڈاکٹر بانو سرتاج ہندی سے اردو، مراٹھی سے اردو، انگریزی سے اردو اور اردو سے ہندی میں بھی کہانیوں کا ترجمہ کر چکی ہیں اور وہ شائع بھی ہو چکی ہیں۔ ان کی اب تک کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جس میں افسانوں کے دو مجموعے ''دائروں کے قیدی'' اور ''اُس کے لیے''، مضامین کا ایک مجموعہ ''قومی یکجہتی اور اردو شاعری''، ڈرامے کے دو مجموعے ''انوکھی بی بی کی سرائے'' اور ''یک بابی ڈرامے'' (حصہ اول و دوم) سائنسی مضامین پر مشتمل ایک کتاب ''دنیا کارٹون اور کامک کیریکٹرس کی'' کے علاوہ لوک کہانیوں کا مجموعہ ''ایک کی گیارہ کہانیاں''، ''دو کی بارہ کہانیاں''، ''تین کی تیرہ کہانیاں''، ''چار کی چودہ کہانیاں'' اور ''پانچ کی پندرہ کہانیاں'' شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ بچوں کے ''یک بابی ڈرامے'' (حصہ اول و دوم) پر انہیں ۲۰۱۵ء میں ساہتیہ اکادمی کا ادب اطفال ایوارڈ (اردو) مل چکا ہے۔ ڈاکٹر بانو سرتاج نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ اصلاح آسی رام نگری سے لی، لیکن جلد ہی نثر کی طرف گامزن ہو گئیں۔ زیر تبصرہ کتاب ''علاقائی زبانوں کی کہانیاں'' ان زبانوں کی ترجمہ شدہ کہانیوں کا مجموعہ ہے جو ہندوستانی آئین کے آٹھویں شیڈول کے تحت بائیس زبانوں میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر بانو سرتاج نے اپنی اس کتاب کا انتساب شری پت رائے جی کے نام کیا ہے جو منشی پریم چند کے صاحبزادے ہیں اور ہندی رسالہ ''کہانی'' نکالتے تھے۔ انہیں کی ترغیب پر موصوفہ ترجمہ نگاری کی طرف مائل ہوئیں، بالخصوص اردو کی کہانیوں کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ کتاب کا سرورق بامعنی اور دیدہ زیب ہے۔ پس منظر میں قومی پرندہ مور کی تصویر ہے۔ مور جب اپنا پنکھ پھیلاتا ہے تو انتہائی دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ اس پھیلے پنکھ میں علاقائی زبانوں کے نام درج ہیں اور پس ورق پر ترجمہ نگار بانو سرتاج کی ایک بڑی سی تصویر ہے۔

کتاب کے پہلے اندرونی فلیپ پر شرون کمار، ایم یوسف انصاری، اقبال انصاری، عتیق احمد عتیق اور ڈاکٹر شباب للت کی رائیں درج ہیں جب کہ کتاب کے آخری اندرونی فلیپ پر ایس اے رحمٰن، شان الحق حقی، رفعت نواز اور رام پرکاش راہی کی آراء شامل کی گئی ہیں۔

''میری بات'' یعنی پیش لفظ میں ڈاکٹر بانو سرتاج رقم طراز ہیں:

''ہندوستانی آئین کے آٹھویں شیڈول میں شامل ۲۲ زبانوں کی ۲۲ کہانیاں اردو قالب میں پیش کر رہی ہوں۔

PDF Compressor Free Version

۲۲ زبانوں سے صرف ایک زبان (سنتھالی) کی کہانیاں دستیاب نہیں ہوسکیں۔ میں نے مختلف اکادمیوں، ادیبوں سے رابطہ قائم کیا مگر کوئی مجھے سنتھالی کہانیاں مہیا نہ کرا سکا۔"

"میری بات" سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کتاب کی تیاری ایک عرصے سے کر رہی تھیں۔ اس تیاری میں انہیں کئی مشکل مراحل سے بھی گزرنا پڑا۔ اس کتاب میں شامل کہانیوں کے لیے انہوں نے متعلقہ کہانی کاروں سے خطوط و موبائل سے رابطہ قائم کیا اور تحریری اجازت بھی لی۔ جو ادیب حیات سے نہیں ہیں، ان کی کہانیاں اپنی ذمہ داری پر ترجمہ کیں۔ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ہندی اور مراٹھی زبان کی کہانیاں چھوڑ کر بقیہ زبانوں کی کہانیاں ہندی سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں اور ہر زبان سے دو کہانیاں منتخب کی گئی ہیں۔

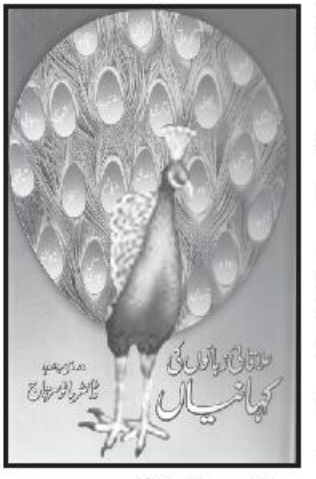

کتاب میں شامل کہانیوں کا ترجمہ ہندی زبان سے کیا گیا ہے۔ زبان اتنی رواں دواں اور خوبصورت ہے کہ ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا بلکہ اصل زبان میں کہانی پڑھنے جیسا لطف آنے لگتا ہے گویا اصل زبان کی روح ترجمہ میں شامل ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر کارگریش بھٹ کی گجراتی کہانی "اب وہ گروہ میں نہیں ہے" کا یہ مترجمہ اقتباس ملاحظہ کریں:

"..... ادھر مالتی یوسف کی کڑک، گرج سن کے بے انتہا خوف زدہ ہوگئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اب کسی بھی لمحے وہ غنڈوں کے حوالے کی جا سکتی ہے۔ آخر اس ضعیف شخص کی بساط ہی کیا؟ وہ فرش پر لڑھک پڑی۔ ممی پاپا کو یاد کر کے رونے لگی۔ آخر وہ کتابیں خریدنے آئی ہی کیوں تھی؟ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا..... تم لوگ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ بزرگوں سے اس طرح بات کی جاتی ہے؟..... چاچا نے ایک کوشش اور کرنی چاہی اور ٹھیک اسی وقت نور بانو وہاں داخل ہوئیں۔ انہوں نے چاچا کو سلام کیا اور روتی ہوئی بولیں: 'چاچا میری بیٹی شبنم اب تک گھر نہیں آئی ہے۔ وہ ڈریس خریدنے کے لیے دوپہر کو گھر سے نکلی تھی۔ نہ جانے کہاں رہ گئی؟ ماحول کتنا مخدوش ہوگیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔" (ص ۱۴۱)

اس کتاب میں آسامی، اڑیا، اردو، کنڑ، کشمیری، کونکنی، گجراتی، ڈوگری، تمل، تیلگو، نیپالی، پنجابی، بوڈو، بنگالی، منی پوری، مایالم، مراٹھی، میتھلی، سندھی، سنسکرت اور ہندی زبان کی کہانیوں کے ترجمے شامل کیے گئے ہیں۔

اردو میں پہلی کہانی غیاث احمد گدی کی "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" شامل کی گئی ہے۔ دوسری کہانی میں ڈاکٹر بانو سرتاج نے اپنی کہانی "شکار" شامل کر لی ہے۔ اس طرح ہندی میں پہلی کہانی نریندر کوہلی کی "وہ کہاں ہے" اور دوسری کہانی خود انہوں نے اپنی کہانی "اس کے لیے" شامل کر لی ہے۔ یہاں وہ خود پسندی کا شکار نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر بانو سرتاج ایک مشہور ادیبہ ہیں، اگر وہ انتخاب کے عمل میں قدرے سختی برتتیں تو مناسب تھا۔

کتاب کے آخیر میں "تعارف قلم کار" کے تحت "فائر ایریا" کو غیاث احمد گدی کا ناول بتایا گیا ہے، جو غلط ہے۔ "فائر ایریا" پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے جو غیاث احمد گدی کے چھوٹے بھائی الیاس احمد گدی کا ناول ہے۔ اس میں صرف ۳۱ قلم کاروں کا ہی تعارف نامہ پیش کیا گیا ہے۔ بقیہ قلم کاروں کا تعارف نہیں ہے۔ اس کے بعد ترجمہ نگار کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ قلم کاروں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں، جن میں صرف اٹھارہ کہانی کاروں کی تصویریں ہی شامل کتاب ہیں۔ یہ کتاب قومی کونسل، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ بلاشبہ، ڈاکٹر بانو سرتاج نے علاقائی زبانوں کی کہانیوں کو اردو میں ڈھال کر ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ انہوں نے مختلف زبانوں کی کہانیوں کے پھولوں کا اردو گلدستہ پیش کر دیا ہے۔ مختلف زبان کی کہانیوں کا ماحول اور تناظر اردو کو منفرد کیف سے آشنا کرتا ہے، اس کے لیے ڈاکٹر بانو سرتاج تحسین کی حقدار ہیں۔ اردو دنیا خصوصاً کہانیوں سے دلچسپی رکھنے والوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی، ایسی توقع ہے۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

ہماری سرگرمیاں

بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام کل ہند اردو صحافتی سمینار، تقسیم ایوارڈ اور مشاعرہ

پٹنہ: گزشتہ ۱۶ اور ۱۷ اپریل کو بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام کل ہند اردو صحافتی سمینار، تقسیم ایوارڈ اور مشاعرے کی شاندار تقریب کا انعقاد ہوا۔ جس میں ریاست اور بیرون ریاست کی قد آور علمی و ادبی شخصیات نے شرکت کی اور اپنے خطابات و مقالات اور سوغات سخن سے نوازا۔ ''اردو صحافت: کل، آج اور کل'' کے موضوع پر منعقدہ اس دو روزہ کل ہند صحافتی پروگرام کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اقلیتی فلاح حکومت بہار و کارگزار صدر اکادمی ڈاکٹر عبدالغفور نے کہا کہ سمینار کا مقصد دراصل کسی مقررہ موضوع پر اپنا محاسبہ ہے۔ اردو صحافت کے ماضی اور حال کا جائزہ لینے سے اس کے روشن مستقبل کا واضح اندازہ ہوتا ہے۔ صحافت اپنے قاری کی نمائندہ بھی ہے اور رہبر بھی، لیکن آج یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اردو آبادی بڑھتی جارہی ہے مگر اردو پڑھنے والوں کی تعداد کیوں گھٹتی جارہی ہے۔ اردو صحافی گویا سماجی طبیب ہیں اور انہیں زندگی کے ہر شعبے میں سنجیدہ عصری دانشوری سے استفادہ کی خاطر اپنی تنظیم بنانا اور مناسب وقفہ سے عملی پیش رفت کے لئے باہمی مشورے کی نشستوں کا اہتمام کرنا اور محبان اردو کی آرا سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ زبان کی ترقی دراصل صحافت سے ہے لہٰذا اردو اخبارات کو زیادہ سے زیادہ دور دراز دیہی علاقوں تک پہونچانے پر توجہ رکھنی چاہئے۔ ہمارا بھلا محض جذبات سے کام لینے میں نہیں بلکہ شعور سے کام لینے میں ہے۔ ہمیں اعلیٰ عصری تعلیمی اداروں کے قیام پر اپنے فکر و عمل کی صلاحیتیں صرف کرنی چاہئے اور صحافت سے قوم کی بہتری اور رہبری کا کام لینا چاہئے۔

پروفیسر محمد اشتیاق وائس چانسلر مگدھ یونیورسیٹی کی صدارت میں منعقدہ اس افتتاحی اجلاس میں وزیر محترم اور صدر محترم کے علاوہ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر اظہار احمد سابق ایم ایل اے اور جناب فاروق ارگلی نے شرکت فرمائی اور اکادمی کے نائب صدور جناب سلطان اختر اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد بھی تشریف فرما رہے۔ پروگرام کے آغاز میں رسم گل پیشی کے بعد سکریٹری اکادمی نے اس محفل میں تقسیم کئے جانے والے اکادمی انعامات کی مختصر تفصیل بتائی اور وزیر محترم کے ہاتھوں پروفیسر عبدالمنان طرزی، جناب قوس صدیقی، جناب نورالہدیٰ، جناب پروین کمار اشکؔ، جناب شوکل احمد، جناب طارق جمیلی، جناب زبیر الحسن غافلؔ، جناب ناشادؔ اورنگ آبادی، جناب رضی حیدر، جناب ابھے کمار بیباکؔ، جناب احمد جاوید، جناب اشرف استھانوی، ڈاکٹر ابرار احمد، جناب معین کوثرؔ، جناب خورشید پرویز صدیقی، ڈاکٹر عابد انور اور جناب سیفؔ سہسرامی کے درمیان ایوارڈ اور توصیفی اسناد کی تقسیم عمل میں آئی۔ واضح رہے کہ متعلقہ حضرات کی انعامی رقوم ان کے بینک اکاؤنٹ میں پہلے ہی بھیجی جا چکی تھی۔

اس موقع پر پروفیسر اعجاز علی ارشد وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسیٹی نے اپنے تعارفی کلمات سے نوازتے ہوئے کہا کہ صحافت بڑی ذمہ داری کا نام ہے اور آج زرد صحافت سے بچنے اور تعمیری صحافت پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اپنے خطاب میں اردو صحافت کو زبان و بیان کی غلطیوں سے پاک رکھنے اور پوری توجہ کے ساتھ درست املا کے استعمال کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

مہمان خصوصی جناب فاروق ارگلی نے اپنے خطاب میں کہا کہ صحافت نے تہذیب و زبان اور ملت کی ہمیشہ ہی بڑی خدمت انجام دی ہے اور شمالی ہند میں خصوصیت کے ساتھ بہار نے اردو صحافت کو ہمیشہ ہی پروان چڑھایا ہے۔ اردو زبان و ادب اور صحافت کی دنیا خاص طور پر اہل بہار کی بدولت شاد و آباد ہے اور موجودہ حالات میں ہمیں اپنے فرائض منصبی کو سمجھنے اور بہتر طریقے سے انہیں بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر اظہار احمد سابق ایم ایل اے نے اردو اخبارات کے مثبت کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں اردو اخبار نکالنا سمندر میں

PDF Compressor Free Version

راستہ بنانے کے برابر ہے اور آج بہار میں جس طرح اعلیٰ معیاری اردو اخبارات نکل رہے ہیں اس کی مثال دوسری جگہ بمشکل ہی مل سکتی ہے۔

پروفیسر محمد اشتیاق نے اپنے صدارتی خطاب میں مقررین کے خیالات کا تجزیہ اور ان کے پیش کردہ اکثر نکات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ واقعی ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ اردو کا حال و مستقبل کیسے بہتر ہو۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ترجیحی طور پر اپنے بچوں کو اردو تعلیم دلائیں اور تمام تر خدمت کے جذبے کے ساتھ اردو صحافت کے معیار کی بلندی کے لئے مسلسل کوشاں رہیں۔ اردو صحافت ہماری آواز ہے۔ ہمیں عام فہم زبان کے استعمال پر توجہ دینی چاہئے اور ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ اردو صحافت سرکولیشن کے لحاظ سے آگے بڑھے اور اس کا اشاعتی مواد عصری تقاضوں کے مطابق ہمارے نوجوانوں کے لئے تعلیمی کیریئر بنانے میں مددگار ثابت ہو۔

اس تقریب میں صدارتی خطاب کے بعد وزیر محترم اور معزز مہمانوں کی خدمت میں مومنٹو پیش کئے گئے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض اپنے خاص انداز سے محترمہ شگفتہ یاسمین نے انجام دیا اور دوران نظامت اردو کے ہمہ جہت امتیازی کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اکادمی کے حالیہ موثر کاموں کی تعریف کی۔ انہوں نے کہا کہ میں بہار کی بیٹی ہوں اور مجھے آج کی اس محفل میں آکر بے حد خوشی اور فخر کا احساس ہے۔

سکریٹری بہار اردو اکادمی مشتاق احمد نوری کے شکریہ کی تجویز پر تقریب کا اختتام ہوا اور پھر وقفہ عصرانہ کے بعد حسب پروگرام 6.30 شام سے جناب سلطان اختر کی صدارت میں منعقدہ مشاعرے میں ریاست اور بیرون ریاست کے متعدد ارباب سخن نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔ پیش ہے اس یادگار مشاعرے کی کچھ سوغات۔

کہیں اب مرا دست طلب نہ پھیلے گا	ضرورتوں کو خبردار کر دیا گیا ہے (سلطان اختر)
مجھے پتہ ہی نہیں ، میرے لمس میں کیا ہے	کہ میرے ہاتھ میں آ کے بولتی ہے کتاب (ارمان نجمی)
ہر طرف پتھروں کی بارش ہے	سر دعاؤں سے ڈھک لیا جائے (حنیف ترین)
میں کیا کروں کہ تری انا کو سکوں ملے	گر جاؤں ، ٹوٹ جاؤں ، بکھر جاؤں کیا کروں (نصرت مہدی)
آپ میری آرزو ، میری تمنا آپ ہیں	کس کو کس کو میں بتاؤں میرے کیا کیا آپ ہیں (عبدالمنان طرزی)
ضرور کھوٹ ہے تقسیم کے طریقے میں	کہیں چراغ بہت ہیں ، کہیں چراغ نہیں (عالم خورشید)
اے محو ناز ، خواہش تکیہ نہ کر	سینے پہ سونے والی کتابیں بگڑ نہ جائیں (انور عباس)
جنوں کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے	مرا کشکول انگاروں سے بھر دے (سیف سہسرامی)
آشیاں روند کے آنسو نہ بہا ، رہنے دے	تجھ سے رشتہ ہے مری بے سروسامانی کا (خورشید اکبر)
ابھی تو چاک پہ جاری ہے رقص مٹی کا	ابھی کمہار کی نیت بدل بھی سکتی ہے (علینہ عترت)
یہ آپ کے بڑے کردار کی ضمانت ہے	زباں کا پاس بھی رکھئے زبان دیتے ہوئے (طارق متین)
جو دل میں روشنی ، آنکھوں میں سچائی نہیں رکھتے	کبھی ہم ایسے لوگوں سے شناسائی نہیں رکھتے (شاہد اختر)
خواہش کی پیاس بجھتی نہیں عمر بھر کبھی	تم لاکھ اپنی سمت سمندر سمیٹ لو (تنویر اختر)
اتنی ذرا سی بات پہ برہم ہیں کیوں جناب	تنقید اپنی ذات پہ سہنے کی رکھئے تاب (زبیر الحسن غافل)
شہر جاں سے کوئی طوفان گزر جانے دے	مجھ کو اس بار ذرا ٹھیک سے مر جانے دے (عزم شاکری)

PDF Compressor Free Version

نفرت کے شجر لوگ اُگانے میں لگے ہیں — اک بیج محبت کا میں دھرتی میں تو بولوں (طارق جمیلی)

ترا خیال مری انجمن میں رہتا ہے — عجیب پھول ہے تنہا چمن میں رہتا ہے (ڈاکٹر وسیم راشد)

شکستہ پر ہیں اور ہم اُڑان رکھتے ہیں — نئے سفر میں نیا آسماں رکھتے ہیں (قاسم خورشید)

محبت کا جہاں چلتا ہے سکہ — میں اس بازار میں بکنا بہت ہوں (پروین کمار اشک)

ہم اچھے مضامین کو عارت نہیں کرتے — بچوں کی طرح ایسی شرارت نہیں کرتے (ناشاد اورنگ آبادی)

لایا ہوں بند کر کے میں سات بوتلوں میں — کس ذات کا لہو ہے، کوئی ڈاکٹر بتا دے (شنکر کیموری)

جس جگہ رہنا سمندر رہنا — اور پیاسوں کو میسر رہنا (ظفر صدیقی)

مرا سوال کہ کس نے مجھے تباہ کیا — ترا سکوت مکمل جواب کی مانند (کامران غنی صبا)

''اردو صحافت: کل، آج اور کل'' کے موضوع پر حسب پروگرام 17 اپریل کو ایک شاندار سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ سیمینار کا پہلا اجلاس جناب فاروق ارگلی، جناب ریاض عظیم آبادی اور جناب عبدالقادر کی مشترکہ صدارت میں 10 بجے دن سے شروع ہوا جس میں ڈاکٹر ابرار رحمانی، محترمہ وسیم راشد، جناب عابد انور، جناب منصور خوشتر، جناب نواب عتیق الزماں اور جناب انوار اللہ نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی نے ''اردو صحافت: سرکاری رسالے'' کے موضوع پر نہایت جامع انداز میں روشنی ڈالتے ہوئے جہاں ایک طرف ''آجکل''، ''اردو دنیا''، ''یوجنا'' اور ''سینک سماچار'' کا ذکر کیا، وہیں دوسری طرف ریاستی اکادمیوں کے رسائل کا ذکر کرتے ہوئے بہار اردو اکادمی کے مجلہ ''زبان و ادب'' کو صوری و معنوی اعتبار سے ایک کامیاب رسالہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ لائق و فائق مدیر جناب مشتاق احمد نوری کی ادارت میں اس کے تمام مشمولات اس کے اعلیٰ معیار کا پتہ دیتے ہیں۔

محترمہ وسیم راشد نے ''دہلی میں اردو صحافت: کل اور آج'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے تمہید کے طور پر جہاں تاریخ کے اوراق سے لی گئی کچھ یادیں تازہ کیں، وہیں نہ صرف دہلی بلکہ بیرون دہلی کے بعض معروف اخبارات و جرائد کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ اردو اخبارات کو اقلیتوں کے مسائل سے مزید قریب لانے کی ضرورت ہے۔

جناب عابد انور نے گلوبلائزیشن اور اردو میڈیا کے تعلق سے اپنے مقالے میں اہم علمی و تکنیکی نکات کی وضاحت کی اور جدید تکنیکی اثرات کے مختلف پہلو کی طرف اشارے کیے۔

جناب منصور خوشتر نے اپنے مقالے میں بہار کے خصوصی حوالے سے اردو صحافت کے ماضی، حال اور مستقبل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ صحافیوں کی ذہنیت میں بہر صورت مثبت تبدیلیاں آئی ہیں اور یہ طے شدہ بات ہے کہ جب ہماری صحافت باوقار ہوگی تو روزگار کے مواقع بھی پیدا ہوں گے۔

''اردو صحافت: قدم بہ قدم'' کے عنوان سے جناب نواب عتیق الزماں نے اپنے مقالے میں میدان صحافت کی نوع بنوع تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت کو ہر زمانے میں معمار و مسیحا ملتے رہے ہیں اور اس کی یہ خوش بختی آج بھی قائم ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آج کے دور میں اردو صحافت تجارت کی طرف نسبتاً زیادہ راغب ہوتی جارہی ہے۔ انہوں نے اپنے مقالے میں کئی اہم مسائل کی طرف توجہ دلائی اور بہار کی اردو صحافت کو ہر لحاظ سے کامیاب اور اطمینان بخش بتایا۔

جناب انوار اللہ نے ''بہار کے تناظر میں اردو صحافت'' پر روشنی ڈالتے ہوئے بہار کے ادبی مجلوں کی خدمات اور صحافیوں کے کمزور معاشی احوال کی

PDF Compressor Free Version

طرف اشارے کئے اور کہا کہ اردو میڈیا کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہماری اہم عصری ذمہ داری ہے۔

اس موقع پر صدور اجلاس نے اپنے خطاب میں اردو عصری صحافت کے متعدد قابل لحاظ پہلوؤں کا تجزیاتی ذکر کیا۔ جناب عبدالقادر نے اردو صحافت کی مجموعی روش کے تعلق کچھ اہم سوالات کی طرف توجہ دلائی اور محض جوش وجذبات سے بچنے اور خود احتسابی سے کام لینے کی ضرورت پر زور دیا۔ جناب ریاض عظیم آبادی نے صحافتی اخلاقیات کے تعلق سے اہم نکات کی نشاندہی کی اور کہا کہ اردو صحافت بہر حال آگے بڑھی ہے اور اس کی ہمہ جہت ترقی کے لئے دیگر امور کے ساتھ ساتھ ہمیں روزناموں کے سرکولیشن بڑھانے کی طرف بھی خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ جناب فاروق ارگلی نے کہا کہ بہار میں ذہانت اور سیاست اُگتی ہے اور ہمیں دیگر باتوں کے ساتھ ان حقائق کو بھی نظر میں رکھنا چاہئے جو اردو صحافت کی مجبوریوں کے مصداق ہیں۔

چائے کے مختصر سے وقفہ کے بعد ایک بجے دن سے سیمینار کے دوسرے اجلاس کا آغاز ہوا جس کی مشترکہ صدارت ڈاکٹر جاوید حیات، جناب احمد جاوید اور جناب سہیل انجم نے فرمائی اور جناب سہیل انجم، جناب فیضان احمد، ڈاکٹر ریحان غنی، جناب نوشاد مومن، جناب شہباز عالم، جناب محفوظ عالم اور جناب احمد جاوید نے اپنے اپنے مقالات سے سامعین کو نوازا۔

''ہم عصر اردو صحافت پر ایک نظر'' ڈالتے ہوئے جناب سہیل انجم نے اپنے پر مغز مقالے میں صحافت کے مناصب کی طرف اشارے کئے اور نہایت خوبصورت زبان میں اپنی گفتگو سے محظوظ کیا۔ جناب انجم نے مختلف جہتوں سے اردو صحافت کو مائل بہ فروغ بتایا اور نوآموز صحافیوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دلائی۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اصطلاح سازی کے مسلسل فروغ اور زبان وبیان کو زوال پذیری کے اثرات سے مامون رکھنے کی جدوجہد سے کبھی غفلت نہیں برتنی چاہئے۔ جناب فیضان احمد نے کہا کہ اگر ایک طرف ماضی کے اکابر صحافیوں کو یاد کرنا ضروری ہے تو دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ آج کے قدآور اردو صحافیوں کے نام لئے جائیں اور ان کے کارنامے بتائے جائیں تاکہ ایک منصفانہ توازن پیدا ہو اور حوصلہ افزائی کی فضا کو استحکام ملے۔ انہوں نے کہا کہ صرف اردو نہیں بلکہ عمومی طور پر آج سبھی زبانوں کی صحافت کے معیار میں فرق آیا ہے اور اسے سنبھالنے کی ضرورت ہے۔

جناب ریحان غنی نے حسب موضوع اپنے مقالے میں اردو صحافت کی تاریخ کا مدلل تجزیہ کرتے ہوئے کئی اہم نکات کی نشاندہی کی۔ انہوں نے جناب غلام سرور جیسے قدآور صحافی کو بصد احترام یاد کیا اور خصوصی تازہ حوالوں کے ساتھ موجودہ عہد میں شعبہ ادارت کے بعض المیوں کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے کہا کہ کارکن صحافیوں کی بڑی اہمیت ہے اور اس کا سچا وبرملا اعتراف ضروری ہے۔

جناب نوشاد مومن نے ''صحافت، عبادت سے تجارت تک'' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج مسائل بڑھے ہیں تو ہماری ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ شکایتوں کے بجائے عملی طور پر کردار کی پختگی لائی جائے اور مفید تربیتی اہتمام کئے جائیں۔ انہوں نے بلند اور واضح نصب العین کے ساتھ کام کرنے اور شعوری طور پر اردو تحفظات کی ترجیحات پر نظر رکھنے کا مشورہ دیا۔

جناب شہباز عالم نے اپنے مقالے میں اردو کے مستقبل کو خوش آئند بتاتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت کی زبان میں حسن وصحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ بنیادی طور پر تعلیم گاہوں میں ہمارے اساتذہ اپنی ذمہ داریوں پر توجہ رکھیں تاکہ صحافت کو عصری اسناد کے ساتھ ضروری اہلیت رکھنے والے افراد ملتے رہیں اور اس کا اسلوب چمکتا رہے۔

جناب محفوظ عالم نے ٹی وی خبروں کی مقبولیت اور اردو چینل کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مقالے میں بعض تکنیکی نکات اور میڈیا کے بعض اہم کردار کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ اردو صحافت نے ہمیشہ ہی بہر حال بہتر سماج کی تعمیر کو اپنی کوششوں کے اہداف بنا رکھا ہے اور اس معاملے میں ٹی وی صحافت کسی طرح پیچھے نہیں بلکہ اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافے ہو رہے ہیں۔ ٹی وی صحافت اپنا واضح ہدف اور توازن رکھتی ہے۔

PDF Compressor Free Version

جناب جاوید احمد نے اپنے مقالے میں کمیونیٹی صحافت کی اہمیت کا احساس دلایا اور ''اردو صحافت کو درپیش چیلنجز'' کا خوبصورت تجزیہ کیا۔ انہوں نے تمثیلی انداز میں اپنی باتیں سننے والوں کے درمیان رکھیں اور کہا کہ صحافت اگر اصول وایمانداری کے ساتھ تجارت بنتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جب صحافت باعزت پیشہ بنے گی تب ہی اسے باوقار فن کا رمل سکیں گے۔ اس موقع پر صدور اجلاس نے اپنے اپنے مخصوص متین انداز سے متنوع تجزیاتی اشارے کئے اور مفید مشوروں سے نوازا۔

جناب سہیل انجم نے جہاں صحافتی اصول واقدار کی پاسداری پر متوجہ کیا، وہیں جناب احمد جاوید نے اردو صحافت کے وسیع منظر نامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ہمیشہ صحت مند پیغام رسانی پر متوجہ رہنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر جاوید حیات نے لفظ ''صحیفہ'' سے صحافت کا رشتہ بتاتے ہوئے اس کے تقدس پر توجہ دلائی اور قرآنی آیات کے حوالوں کے ساتھ اپنی گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ وسیع مفہوم میں جب صحافت کا تعلق صحیفہ سے ہے تو ہمیں آسمانی صحیفہ کی ہدایتوں کی پابندی کرنی چاہئے۔ صحافت اعمال کے دفتر کھولنے کا نام ہے اور اس کے پاکیزہ آداب پر بہر صورت توجہ دینی چاہئے۔

وقفہ طعام کے بعد سمینار کے تیسرے اور آخری اجلاس کا آغاز ساڑھے تین بجے دن سے ہوا جس کی مشترکہ صدارت کے فرائض جناب خورشید ہاشمی، جناب ایس ایم اشرف فرید اور ڈاکٹر مشتاق احمد نے انجام دیے اور جناب نور السلام ندوی، جناب شرف الہدیٰ، جناب شمس تبریز قاسمی، جناب خورشید پرویز صدیقی، جناب اشرف استھانوی اور جناب دانش ریاض نے اپنے اپنے مقالات سے سامعین کی ضیافت کی۔ جناب نور السلام نے عصری صحافت کے متنوع امتیازی پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ آج کی اردو صحافت میں کئی خوشگوار تبدیلیاں آئی ہیں، اس میں تحقیقی وتجزیاتی رجحان بڑھا ہے اور یہ دیگر زبانوں سے کہیں زیادہ ملک وقوم کی ہمہ گیر خدمت کر رہی ہے۔ آج کی صحافت کو جدید تکنیک نے بھی بہت کچھ دیا ہے اور یقیناً اس کا حال ومستقبل ہر لحاظ سے روشن ہے۔

جناب شرف الہدیٰ نے حوالوں کے ساتھ صحافت کی علمی تعریف پیش کرتے ہوئے کہا کہ لفظ صحافت کا رشتہ صحیفہ سے ہے جو زندگی اور بندگی کا پیغام دیتا ہے۔ آج کی صحافت پر صارفیت کے اثرات ضرور پڑے ہیں، لیکن یہ ہمیں نوع بنوع ذہنی وفکری غلامی سے آزادی دلانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ مظلوموں کی آواز اور ہماری تہذیب کی علامت ہی نہیں اس کی امین بھی ہے۔

جناب شمس تبریز قاسمی نے اپنے مقالے میں صحافت کی ہمہ جہت عصری قوتوں کا ذکر کرتے ہوئے، اردو اخبارات کے قارئین کا حلقہ بڑھانے، خبر نگاری کا معیار بلند کرنے اور صحافت کو تہذیب سے قریب تر لانے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ صحافت سے وابستگی رکھنے والوں کا اخلاقی کردار ہمیشہ بلند رہنا چاہئے۔ جناب خورشید پرویز صدیقی نے پڑوسی ریاست جھارکھنڈ کے تناظر میں اردو صحافت کے ماضی، حال ومستقبل کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیتے ہوئے مین اسٹیم اخباروں کی ذہنیت بتائی اور صحافتی فلاح کے ضروری اقدامات پر متوجہ کیا۔

جناب اشرف استھانوی نے اپنے مقالے میں بہار کے ان صحافیوں کو یاد رکھنے کی ضرورت بتائی جو آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ آج کے حالات میں اردو صحافت کو نئی نسل کی ذہنی وتعلیمی اور تربیتی ضرورتوں کا کفیل بننا لازمی ہے اور یہ بھی کہ نئی نسل کو واقعی اردو آشنا بنایا جائے تاکہ قارئین کا حلقہ بڑھے اور سرکولیشن کے لحاظ سے اردو صحافت کو استحکام مل سکے۔

جناب دانش ریاض نے اپنے مقالے کے توسط سے عصری اردو صحافت کے بعض مسائل اور اس کے بعض اہم اختصاص کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت نے گنگا جمنی تہذیب کو سنبھال رکھا ہے اور یہ محض ایک بات نہیں، بہت بڑی اور بہت اہم بات ہے۔

اس موقع پر صدور اجلاس نے مقالات کا علمی وفکری تجزیہ کرتے ہوئے کئی اہم نکات کی نشاندہی کی۔ جناب خورشید ہاشمی نے کہا کہ صحافی کو بہر حال بردبار اور حلیم ہونا چاہئے۔ صحافت کو تجارت بنانا برا نہیں بلکہ بے قاعدگی سے تجارت بنانا برا ہے۔ آج ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم صحافت کی اہمیت کو

PDF Compressor Free Version

سمجھیں اور اس کے توسط سے اپنی اہلیت اور طاقت ثابت کریں۔ جناب ایس ایم اشرف فرید نے کہا کہ اردو صحافت کی تاریخ سرتاپا قربانیوں کی تاریخ ہے اور اردو اخبار نکالنا جہد مسلسل کے مصداق ہے۔ ہماری آواز اردو صحافت کی بدولت ہی بلند ہوتی ہے اور یہ اطمینان کی بات ہے کہ آج پورے عزم کے ساتھ اردو روزنامے نکل رہے ہیں۔ اردو صحافت خاص طور سے اردو آبادی کے لئے ایک اہم ستون کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد نے جہاں ایک طرف اس سیمینار کے مقالات کا علمی تجزیہ کرتے ہوئے انہیں معیاری بتایا وہیں راہ صحافت میں ہر لحاظ سے محتاط رویہ اپنانے پر توجہ دلائی۔ انہوں نے اس سیمینار کے لئے بہار اردو اکادمی کو مبارکبادیوں کا مستحق قرار دیا اور کہا کہ ایسے پروگرام کی افادیت چند در چند ہے۔

سمینار کے تینوں ہی اجلاس کی نظامت کے فرائض محترمہ شگفتہ یاسمین نے انجام دے اور حسب روایت تینوں ہی اجلاس کے اختتام پر مقالہ خواں و دیگر حضرات کو نائب صدر اکادمی جناب سلطان اختر کے دست مبارک سے مومنٹو پیش کیا گیا۔ سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری کے کلمات تشکر پر سیمینار کا اختتام ہوا۔ جناب نوری نے حاضرین سے چند منٹوں کا وقت لے کر بڑی دلسوزی کے ساتھ اپنی باتیں کہیں اور اپنے مصمم عزائم کا اعادہ کیا۔ انہوں نے اردو صحافت کی بعض مجبوریوں کی اشارے کرتے ہوئے کہا کہ صحافت کو تجارت بننے میں مضائقہ نہیں ہے، البتہ فکر کی بات یہ ہے کہ ہمیں تجارت کرنے کی اخلاقیات نہیں آرہی ہے۔ ہمیں دوسروں پر اعتراضات کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی خود بھی آئینہ دیکھ لینا چاہئے اور صرف منفی پہلو اجاگر کرنے سے بچنا چاہئے۔ انہوں نے صحافیوں کو معتدل رویہ اپنانے کی تلقین کی اور کہا کہ سچائی کا اظہار اس طرح ہونا چاہئے کہ کسی کا دل نہ دکھے۔ جناب نوری نے اپنے معترضین کو بھی کلمات تشکر سے یاد کیا اور اس اعلان پر اپنی بات ختم کی کہ بہت جلد اکادمی کے زیر اہتمام انشاء اللہ صحافتی ورکشاپ کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔

اکادمی کے ذریعہ بزرگ شاعر معصوم شرفی اسیرؔ کی پزیرائی اور معاونت

پٹنہ: معمر اور بزرگ فن کاروں کی پزیرائی اور حسب حالات ان کی معاونت، اکادمی کی دیرینہ سرگرمیوں کا ترجیحی حصہ رہی ہے۔ اس روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے، گزشتہ دنوں ۲۶ اپریل کو معمر و بزرگ شاعر جناب معصوم شرفی اسیرؔ سے اکادمی سکریٹری مشتاق احمد نوری نے بغرض عیادت ملاقات کی اور اکادمی کے جانب سے انہیں پچیس ہزار روپے اعانت کے طور پر پیش کئے۔

واضح رہے کہ جناب اسیرؔ ایک لمبے عرصے سے بیمار ہیں اور نہایت نحیف ہو چکے ہیں۔ اکادمی کی جانب سے معاونت پر جناب اسیرؔ نہ صرف یہ کہ بے حد خوش ہوئے اور ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازا بلکہ فرط جذبات سے اس موقع پر ان کی آنکھیں بھر آئیں، آواز رندھ گئی اور بہت دیر تک وہ سکریٹری موصوف کا ہاتھ تھامے رہے۔ اس موقع پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے جناب نوری نے کہا کہ ان کی بیماری و کس مپرسی کا حال دیکھ کر مجھے بے حد دکھ ہوا اور ان کا ماضی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ایک دور تھا کہ وہ شہر عظیم آباد اور بیرون شہر کی شعری محفلوں میں اپنے کلام سے سامعین کو نوازتے اور بے پناہ داد وصول کرتے تھے، ساتھ ہی ساتھ مقامی روزناموں میں حالات حاضرہ پر ان کے قطعات بھی شائع ہوتے اور شوق سے پڑھے جاتے تھے، لیکن آج اپنی بیماری اور نقاہت کے باعث وہ پہچان میں نہیں آرہے تھے۔

جناب نوری نے مزید کہا ایسے مایہ ناز و تاریخ ساز اور معمر فن کار کی اعانت اکادمی کے لئے باعث فخر ہے۔ جناب معصوم شرفی اسیرؔ جیسے بزرگ ادب و شاعری میں باقیات الصالحات کا درجہ رکھتے ہیں جنہوں نے زندگی بھر شعر و ادب کی خدمت کی اور کبھی بھی اپنی خدمتوں کا کوئی معاوضہ نہیں چاہا۔ سکریٹری موصوف نے اس عزم کا بھی اظہار کیا کہ اکادمی آئندہ بھی ایسے ارباب علم و سخن کی پزیرائی کرتی رہے گی، جنہوں نے اپنی پوری زندگی شعر و ادب کی خدمت میں لگادی، مگر اب وہ شخصیت فراموشی کے عام رجحان کا شکار ہو چکے ہیں۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

سلام و پیام

☆ امید ہے مع اہل و عیال آپ بخیر ہوں گے۔تقریباً دو ماہ تک مختلف شہروں کا چکر لگانے کے بعد میں کلکتہ واپس آ گیا ہوں۔ پٹنہ چھوڑتے وقت آپ سے مل کر شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اللہ میاں نے آپ کو اردو اکادمی اس لئے بھیجا کہ مجھ جیسے گوشہ نشیں نوازے جائیں، ورنہ بقول شیخ سعدی ''بے تمیزار جمند و عاقل خوار'' بہت سارے اہل علم چپ چاپ گزر جاتے ہیں اور انہیں کوئی نہیں پوچھتا ہے۔ آپ نے بلاشبہ اس بدعت یا روایت کو توڑا ہے، اس کے لئے آپ کو معاصرانہ چشمک اور معاندانہ ماحول کی تلخیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، اس کے باوجود جس عالمانہ ضبط و تحمل اور صلابت فیصلہ کے ساتھ آپ نے اکادمی کے تمام پروگراموں کو بخیر خوبی انجام تک پہونچایا، اس کی داد دینی ضروری ہے۔اس تحریر میں کسی تملق یا ریا کا شائبہ نہیں ہے۔ ہم نے جو چند الفاظ آپ کو سکھائے ہیں، اس کی بڑی قدر اور بڑا احترام آپ نے کیا ہے۔شاگرد تو ہمارے سینکڑوں بلکہ ہزاروں ہیں، لیکن آپ جیسی خوبیوں والے چند ہی ہیں۔ خدا آپ کو اور تمام متعلقین کو آسودہ حال رکھے اور آپ جس دینداری اور تقویٰ کی جن راہوں سے گزر رہے ہیں، تاحیات یہ سفر باقی رہے۔ مارچ کا ''زبان و ادب'' مل گیا ہے۔ اپریل کے پرچے کا انتظار ہے۔ امید ہے ہر ماہ رسالہ ملتا رہے گا۔ مارچ کا رسالہ اور اس کا ٹائٹل پیج تو چند آرٹس کا نمونہ ہے۔ آپ کے ذوق جمال کی داد دینی چاہئے۔ میری عمر اسی سال سے اوپر ہو گئی۔ ستر سال سے متعدد علمی رسائل سے واسطہ رہا ہے، ایسا قیمتی ٹائٹل پیج جو سائنٹفک بھی ہے، ہماری نگاہ سے نہیں گزرا۔ اس پر جو تصویر ہے وہ آپ کے کسی افسانے کا موضوع بھی بن سکتی ہے۔ اس کا عنوان رکھئے گا ''ہر فرعونے را موسیٰ'' اس ضمن میں ایک اچھا سا شعر بھی ہے، دام، نہنگ جیسے الفاظ ہیں، ابھی یاد نہیں آ رہا ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو۔ جو ندرت اور انفرادیت ٹائٹل پیج کی ہے، وہی آپ کے اداریہ کی بھی ہے۔ نظم کی شکل میں اداریہ لکھ کر آپ نے اداریہ نگاری کی پوری تاریخ میں مجتہدانہ روش کی ابتدا کی ہے۔اس کا پیغام بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ لیجئے خط کیا ہوا ایک مضمون ہو گیا۔ سیمنار کے الوداعی جلسے میں آپ نے جس عزم و استقلال کا اعادہ کیا ہے، اس پر قائم رہئے۔ کامیابی آتی ہے تو مخالف بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ کمال علم اور معیار سخن کا لازمی نتیجہ رشک و حسد بھی ہے غالب کا ایک شعر دیکھئے ؎

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجئے
ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہئے

نور الہدیٰ، کلکتہ

☆ عزیز محترم نوری صاحب، خدا کرے تمام مشغولیتوں کے باوجود آپ بخیر و عافیت ہوں، فون سے رابطہ نہ ہو سکا تو خط کا ہی سہارا لیا۔ ''زبان و ادب'' فروری ۲۰۱۶ء کے اداریے کے آخر میں آپ نے چند سطور بہت ہی کام کے لکھے ہیں۔ یہ کام تو قومی رہنماؤں کا بھی ہوتا، لیکن انہیں ناموری سے فرصت کہاں! آپ نے اردو لائبریریوں کے ذریعہ اردو کی بقا اور ترویج کی جو باتیں اداریے میں کی ہیں وہ بہت ہی قابل قدر اور دانشورانہ ہیں۔ اردو کے لئے آپ کا جوش اور ولولہ نہایت ہی قابل قدر ہے۔ خدائے پاک آپ کی مدد کرے۔

شمس جلیلی، پورنیہ

☆ بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ وقت پر دستیاب ہو جاتا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ میرے خیال میں مجلّہ جتنا بھی بہتر ہو رہا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اردو ادب سے قلبی لگاؤ ہے اور آپ ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ مجلّہ بہتر سے بہتر ہو۔ میں نے ڈاکٹر ارشد اقبال کا مضمون زیر عنوان ''منٹو کی جنسی معنویت'' کا مطالعہ کیا۔ منٹو تو جنسی مضامین کے لئے بدنام ہیں۔ جنسی تہوں کو وہ جس طرح بے نقاب کر کے پیش کرتے ہیں ویسا کم ہی لوگ کیا کرتے ہیں، لیکن کیا کوئی بھی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ انسان کے اندر جنسی بھوک نہیں ہوا کرتی ہے۔ یہی جنسی بھوک تو تخلیق عالم کا ذریعہ ہے اور اسے قدرت نے بنایا ہے۔ اب رہا اس کے اظہار کا طریقہ تو الگ الگ فنکار کے یہاں اسے پیش کرنے کا ڈھنگ الگ الگ ہے۔ منٹو کی کہانیوں میں

PDF Compressor Free Version

منظرنامے اور جزئیات تو روایتی ہیں، لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے حقیقت کو نفسیات کے حوالے سے دیکھا ہے۔ وہ ایک حقیقت پسند اور صاحب نظر ادیب ہے۔ سیمین کرن کی تحریر ''آتش رفتہ کا سراغ'' سرسٹھ برسوں کی تقسیم ملک کی دردناک داستان ہے۔ ظلم ظلم، قتل قتل ہے خواہ وہ مسلمان کا ہو یا ہندو کا یا کرسچن کا یا سکھ کا۔ اگر ہم کسی بھی مذہب میں یقین رکھتے ہیں تو ہمیں ظلم سے نفرت اور انسان یعنی ہندو، مسلم، کرسچن، بدھسٹ وغیرہ سب سے محبت کرنی چاہئے۔

اختر حسین آفتاب، عظیم آباد کالونی، پٹنہ

☆ بہار اردو اکادمی میں آپ کی تقرری یقیناً ایک نیک فال ہے۔ سات، آٹھ مہینوں کی مختصر مدت میں آپ نے دن رات جس محنت، لگن، دلچسپی اور دلجمعی سے اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لئے اپنے نت نئے اقدامات سے نوع بنوع خدمتیں انجام دی ہیں، یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ اب اردو اکادمی صرف پٹنہ نہیں بلکہ بہار کے گوشے گوشے میں اردو عوام کے بیچ جانی پہچانی جارہی ہے اور ملک بھر میں آپ کی کارگزاریوں کی افادیت کو شدت سے محسوس کیا جارہا ہے۔ دلی ہو یا بنگلور، حیدرآباد ہو یا بھوپال، ممبئی ہو یا کلکتہ یا لکھنؤ ہر جگہ آپ کے قابل قدر اقدامات کی بھرپور ستائش ہورہی ہے۔ اب تک اکادمیوں سے لوگ یہی توقع رکھتے تھے کہ سال بھر میں دو چار ادبی تقریبات اور مشاعروں کا انعقاد ہو جائے اور ادبا وشعرا کے بیچ انعامات تقسیم کردیے جائیں، لیکن جناب والا، آپ نے تو ملک بھر کی اکادمیوں کے تمام پچھلے ریکارڈ توڑ دیے اور پے در پے مقامی، قومی اور بین الاقوامی علمی، ادبی اور شعری تقریبات کی جھڑی لگادی۔ اہم ادبی شخصیات اور خواتین پر، قومی سطح پر نہایت جاندار اور شاندار سمیناروں کا انعقاد ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ''اکادمی آپ تک'' تو بالکل نیا تجربہ ہے۔ ریاست کے دور دراز علاقوں میں ادبی اور شعری نشستوں کا انعقاد اور وہاں کے بزرگ ادبا وشعرا کی عزت افزائی، قدردانی اور مالی اعانت نہایت مستحسن قدم ہے۔ ''زبان وادب'' کی تو آپ نے ہیئت ہی بدل دی ہے۔ دیدہ زیب اور Symbolic سرورق، بصیرت افروز اداریے، مشاہیر ادب کے عالمانہ مقالے اور مضامین، بلند پایہ افسانے اور شعری تخلیقات، معیاری تبصرے، قارئین کے فکر انگیز خطوط، ان سب نے مل کر اسے ہندوستان کے اردو رسالوں میں ایک منفرد اور ممتاز رسالہ بنادیا ہے۔ بچوں کا حصہ بھی دلچسپ ہے، مگر یہ الگ سے شائع ہو تو بہتر ہوگا۔ خدا کرے آپ کی متحرک اور فعال قیادت میں اکادمی کامیابی وکامرانی کی نئی منزلیں طے کرے۔

(پروفیسر) محمد انوار الحق تبسم، پٹنہ سیٹی

☆ ماہنامہ ''زبان وادب'' اپریل ۲۰۱۶ء پیش نظر ہے۔ اس میں عام قارئین کی دلچسپی سے لے کر بچوں کا ادب اور ریسرچ کے شعبے میں کام کرنے والے طلبا وطالبات کے لئے بھی پورے مواد فراہم کئے گئے ہیں۔ تازہ رسالے کا سرورق اپنی خوبصورتی اور زیبائش کی مثال آپ ہے۔ اس کے حسن اور سادگی میں کئی معنی چھپے ہیں جو ہر کسی کو دعوت نظر دے رہے ہیں۔ بہرحال کچھ لکھنے سے قبل میں پچھلے شمارہ یعنی مارچ ۲۰۱۶ء کا ذکر کرنا بے حد ضروری سمجھتا ہوں، جس کے اداریے میں آپ نے بڑی خوبصورت کے ساتھ قلم کاروں کو کچھ کرنے کی دعوت دی ہے۔ آپ نے اپنے ''حرف آغاز'' کو نثری نظم کے قالب میں ڈھال کر یقین جانئے کہ مشمولات رسالہ کے علاوہ ''اداریہ'' کو بارہا پڑھنے پر مجبور کردیا ہے۔ اس اداریہ میں آپ نے ادب، ادب کی خصوصیت، ادیبوں اور فنکاروں اور قلم کاروں کو حوصلہ شکن ہونے سے بچالیا ہے، جسے پڑھنے سے بڑی ہی تقویت ملتی ہے۔ یقیناً ایسی تحریروں سے قلم کاروں، ادیبوں اور خصوصاً نئی نسل کو ادب، زبان اور لسانیات کے شعبے میں خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس شمارے کے تمام مقالات قابل مطالعہ اور افادیت کا پہلو اپنائے ہوئے ہیں۔ ان میں جہاں ''مادری زبان میں تعلیم: وجود اور شناخت کی ضمانت''، ''طنز وظرافت کا رشتہ''، ''قومی یکجہتی کے علمبردار: سرسید احمد خاں''، ''تمنا مظفرپوری کی ڈرامہ نگاری'' بزرگ ادیب شفیع مشہدی صاحب کا افسانہ ''پنڈدان'' اور منظومات کے سکشن میں ''لمحوں کا حاصل'' اور ''چاندنی'' دل کو چھوگئے۔ وہیں غزلیں بھی اپنی جگہ خوب ہیں۔ ''کتابوں کی دنیا'' کے تعلق سے دونوں تبصرے قارئین کے مطالعہ میں اضافہ رکھتے ہیں۔ بچوں کے حصہ میں ''رکشہ والا'' بڑی ہی

سبق آموز نظم ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ دوروزہ عالمی اردو کانفرنس میں معزز مہمانوں کی کہکشاں، شرکا اور سامعین کے مناظر رسالے کی زینت میں چار چاند لگاتے ہیں۔ رسالہ ہر اعتبار سے معیاری ٹھہرتا ہے اور اس کے لئے حکومت بہار کے محکمہ اقلیتی فلاح ڈاکٹر جناب عبدالغفور اور دیگر رفقا بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شرف الہدیٰ، پٹنہ

☆ قدرت کے حسین مناظر کا انکشاف کرتا ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ (اپریل ۲۰۱۶ء) واقعی دیکھنے کے قابل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ٹائیٹل پیج کی یہ پیش کش ایک خوبصورت فکر کی غماز ہے، ص ۳۰ ص ۳۴ کی ۳۹ سطری تحریر قابل تائید ہے، مگر ''اداریہ'' کے علاوہ بھی کئی جگہ، ہر بار کی طرح اس بار بھی خاص پروف ریڈنگ کی ضرورت تھی۔ صفحہ نمبر ۲ کے اداریہ سے ''او'' کا چھوٹ جانا اس کی زندہ مثال ہے۔ امید ہے کہ اس کا خیال آئندہ رکھا جائے گا، خیال تو رکھا ہی جاتا ہوگا مگر نظر کی چوک کا ہونا کوئی بعید از قیاس امر نہیں ہے، غزلوں کی کائنات کا ہر شاعر لائق توجہ ہے، مگر خورشید طلب اور راشد جمال فاروقی نے کافی متاثر کیا۔ مشتاق احمد نوری صاحب کا یہ عندیہ بہتر ہے، انہوں نے اس شمارے میں تمام ریسرچ اسکالرز کی نگارشات کو شامل کیا۔ غالباً ایسا پہلی بار کیا گیا ہے جو دوسروں کے لئے بھی مشعل راہ ہوگا۔ شاہد الرحمٰن صاحب کو مضمون کے اعتبار سے مناسب مقام دیا گیا ہے اس سے عمدہ مراتبت کا پتہ چلتا ہے۔ ناصر کاظمی صاحب کے ایک شعر کو پڑھ کر مجھے اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

نہ ہوگی آپ کو دستک کی زحمت
کہ اپنے گھر میں دروازہ نہیں ہے

ناصر کاظمی کی شاعری زبان کو درست اور دل کو خوش کرنے والی شاعری ہے۔ صفحہ ۱۷ کے عنوان ''تمنا مظفر پوری کی ڈرامہ نگاری'' نے مجھے آبدیدہ کر دیا۔ ہائے! کیا مرنجاں مرنج طبع انسان تھے تمنا مظفر پوری صاحب، خدا ان کی قبر کو فردوس بریں میں تبدیل کر دے۔ میں تو سمن پورہ میں تنہا ہو کر رہ گیا۔ ایسا خلیق وخاکسار آدمی اب ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا ہے، ان کی گلی اور ان کا دروازہ دیکھ کر تمام یاد ماضی تازہ ہو جاتی ہے۔ نشاط اختر صاحبہ نے ان کے متعلق کما حقہ، حق رشحات قلم ادا کر دیا ہے، میں نشاط صاحبہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، بلاشبہ سرسید احمد خاں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر ان پر بہت کچھ لکھنا باقی جیسا لگتا ہے۔ ان پر فرحت بانو صاحبہ کا مضمون انتہائی فرحت بخش ہے۔ امان اللہ صاحب کا مضمون اپنی نوعیت کا ایک اچھوتا مضمون ہے۔ دیگر قلم کاروں کی محنت بھی حقدار ستائش ہے۔

شکیل سہسرامی، پٹنہ

☆ آپ تو اخبار و رسائل اور کتب پڑھتے رہتے ہیں پھر ''زبان و ادب'' میں مہمل مراسلہ چھاپ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ کسی خالد عبادی کا مراسلہ پڑھ کر ہنسی آئی اور افسوس بھی ہوا کہ نئی نسل کے ایسے قلم کار جنہیں قلم پکڑنا نہیں آتا اور جو مطالعہ نہیں کرتے ہیں، وہ مراسلہ میں الٹی سیدھی ہانک کر اپنا نام چمکانا چاہتے ہیں۔ قلم کے ایسے مریض ہر جگہ مل جائیں گے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد کے بیحد معیاری مضمون میں کیڑے نکالنے کے لئے انہوں نے جو حربہ استعمال کیا ہے اس سے ادب سے ان کی ناواقفیت کا اندازہ ہوا اور یہ کہ وہ کنویں کے میڈک سے بھی غیر اہم ہیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے بحیثیت شاعر اردو کو جتنی کتابیں دی ہیں اور جتنے نئے تجربے سے اردو کو مالا مال کیا ہے اس کے سوچنے کے لئے عبادی جیسے نو سکھیے کو کئی عمر چاہئے۔ صرف غزل اور نظم کو لیں تو ہرگانوی صاحب کی ایسی شاعری پر وزیر آغا، سلام سندیلوی، محمد حسن، فہیم اعظمی، انور سدید، نظام صدیقی، عبدالقوی دسنوی، ماجد الباقری، ساحل احمد، سلیمان اطہر جاوید، زار علامی، کوثر جائسی، سید حسن عباس، آزاد گلاٹی، ناوک حمزہ پوری، مشتاق احمد نوری، شام بارکپوری، اسلم حنیف، امام اعظم اور درجنوں دوسرے دانشوروں نے مقالے لکھے ہیں اور ہرگانوی صاحب کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری پر رائے دینے والوں میں آل احمد سرور، گوپی چند نارنگ، اوپیندر ناتھ اشک، گیان چند، مختار الدین آرزو، جگن ناتھ آزاد، شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، کالی داس گپتا رضا، رام لعل، جوگندر پال، کرامت علی کرامت، رضا نقوی واہی، دیویندر اسر، سید حامد حسن، مظہر امام، تاراچرن رستوگی، بشیر بدر، ایوب جوہر، شین

PDF Compressor Free Version

PDF Compressor Free Version

مظفر پوری، کرشن موہن، منظر شہاب، محمد انصار اللہ، احمد سجاد، حفیظ بنارسی اور درجنوں دوسرے نام ہیں جن کے بارے میں صرف سوچا جاسکتا ہے۔ خالد عبادی جیسے نوآموزوں کو پتہ ہونا چاہئے کہ مذکورہ تمام دانشوروں کے مضامین اور آرا پٹنہ کے اور ملک کے دیگر شہروں کے اخبار ورسائل میں مطبوعہ ہیں۔ وہ ڈاکٹر نیر حسن نیر کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی: بحیثیت شاعر'' اور ڈاکٹر مظفر مہدی کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی کی شاعرانہ جہتیں'' ساتھ ہی احمد معراج کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی کی آنکھوں دیکھی: تجزیہ'' پڑھ لیں تو آئندہ مراسلہ لکھنے سے توبہ کرلیں گے۔ انہوں نے ناشاد اورنگ آبادی جیسے استاد شاعر پر بھی انگلی اٹھائی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ وہ ناشاد صاحب کی شاگردی اختیار کرلیں تاکہ سوچ کی اڑان کو پر لگ سکیں اور شاعری سمجھنے کی شد بد آسکے۔

اسماء پروین، سستی پور

☆ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ ملا۔ سرورق کی تزئین کاری نے دل و دماغ پر ایک دیرپا نقش ثبت کردیا۔ میری عادت ہے کہ جیسے ہی ڈاکیہ رسالہ دے جاتا ہے، میں ورق گردانی شروع کردیتا ہوں۔ ورق گردانی کے دوران میری نگاہ منزہ احتشام گوندل کے افسانہ ''کمرے سے کمرے تک'' کے ایک جملے پر پڑی۔ ''مائیں بھی مالک کی طرح بے نیاز ہوتی ہیں۔ وہ اپنی مخلوق سے صرف تابعداری مانگتی ہیں، بندگی اور عبادت گزاری مانگتی ہیں، نافرمانی ہوجائے تو دوزخ دہکادیتی ہیں۔ الٹا لٹکادیتی ہیں۔'' (ص ۳۳) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مصنفہ نے کس مقصد کے تحت اس جملے کی تخلیق کی۔ ان کی سوچ کیا ہے؟ کہنے کا مقصد اور غرض وغایت کیا ہے؟ مجھے اپنے ایمان کی کم مائیگی کا احساس ہے، لیکن یہ جملہ پڑھ کر بے چین ہوا ٹھا۔ حقیر بندے (مائیں) کا موازنہ معبود (مالک حقیقی) کے ساتھ، یہ بالکل عقل سے پرے ہے۔

محمد گلزار عالم، آسنسول

☆ ''زبان وادب'' اپریل ۲۰۱۶ء دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی کیکٹس، سورج مکھی، لالہ و نسترن اور گلاب کی کئی قسمیں دعوت نظارہ دے رہی ہیں۔ زیر نظر شمارے کے اداریے میں آپ نے شہرت کے بھوکوں کی خوب خبر لی ہے، مشرف عالم ذوقی کا مقالہ ''راج نارائن راز: ادھوری یادوں کا مکمل بیان'' بہت اچھا لگا۔ اسی طرح کے تاثرات کا اظہار اپریل ہی کے ماہنامہ ''آج کل'' میں جناب منیر سیفی نے بھی کیا ہے، جس سے اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ راز صاحب پارکھ، اچھے اور بالکل سچے قلم کار تھے۔ اس شمارے کے سبھی مقالات پرمغز اور مطالعہ کے متقاضی ہیں، کہانیاں بھی عصری آگہی سے مملو ہیں، نظمیں اور غزلیں بھی خوب سے خوب تر ہیں۔ مکتوبات جہاں معلوماتی ہیں، وہیں ''تیر نیم کش'' کی خلش بھی رکھتے ہیں۔ شکیل بھائی نے بغیر کسی ثبوت کے اپنے مکتوب میں سرقہ کی بات لکھی ہے کہ میرا مطلع (ڈالے گا، نکالے گا) کئی لوگوں نے اپنے نام کرلیا اور میرے مطلع (مہمان ہوجانا، آسمان ہوجانا) کو بھی سرقہ کرنے کی کوشش کی گئی، مگر کامیابی نہیں ملی۔ اس ''کامیابی نہیں ملی'' کا جواب نہیں۔ شکیل بھائی نے پہلا مطلع (ڈالے گا، نکالے گا) تو پروفیسر اعجاز علی ارشد کے یہاں سے اڑایا ہے۔ (بحوالہ روزنامہ ''پندار'' پٹنہ ۲۲ر اپریل ۲۰۱۶ء) اتنا ہی نہیں، مہاراشٹر کے بزرگ شاعر شمیم عباس کی غزل کے دو شعر صرف ماضی کو حال بنا کر انہوں نے ''پندار'' میں شائع کرادیا تھا۔ ملاحظہ کیجئے۔

عروج مجھ کو تو خود کو زوال کرتا تھا
کمال کا تھا وہ سچ مچ کمال کرتا تھا
بس ایک میں جسے سبقت تھی سارے عالم پر
سبھی جنوب تھے مجھ کو شمال کرتا تھا

(شمیم عباس ''کتاب نما'' ستمبر ۲۰۱۴ء ص ۵۶)

عروج مجھ کو تو خود کو زوال کہتا ہے
کمال یہ ہے کہ اس کو کمال کہتا ہے
حسین شوخ طبیعت مجھے چڑھانے کو
جنوب کو بھی وہ قصداً شمال کہتا ہے

(شکیل سہسرامی روزنامہ ''پندار'' پٹنہ ۱۴، دسمبر ۲۰۱۴ء)

قارئین خود فیصلہ کریں کہ سارق کون ہے؟ شکیل بھائی کا تو املا تک درست نہیں ہے۔ ''چڑانا'' کو ''چڑھانا'' اور ''اڑان'' ''آڑان'' لکھتے ہیں۔ شکیل بھائی ہنوز غزل کے مہد سے پاؤں نہیں نکال

PDF Compressor Free Version

سکے ہیں۔ موصوف نے اپنی چوری چھپانے کے لئے اتنا واویلا مچایا کہ لوگ انہیں چور کی ضد سمجھنے لگے۔ جھوٹ کو بار بار سچ بنانے کی کوشش کی جائے تو جھوٹ سچ ہو جاتا ہے، لیکن سچ کو بار بار جھوٹ بنانے کی کوشش کی جائے تو سچ جھوٹ نہیں بنتا، لہٰذا شکیل بھائی ''زبان وادب'' کے قارئین سے تحریر معافی مانگیں ورنہ وہ طرح میں پانچ آدمی کی کمیٹی کے سامنے پانچ اشعار موزوں اور بے عیب کہیں، میں انہیں پانچ ہزار نقد دوں گی۔ موصوف کو شرط منظور ہو تو ''زبان وادب'' میں اعلان کریں۔

روشن آرا، بھنور پوکھریٹنہ

☆ اردو اکادمی کی ذمہ داری خصوصاً ماہانہ ''زبان وادب'' کی خدمات آپ بہ حسن خوبی انجام دے رہے ہیں۔ اکادمی سے لائبریریوں کا الحاق ایک نیک قدم ہے، بلکہ اسے انقلابی قدم کہا جانا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ آپ کے ذریعہ اردو لائبریری کو الحاق کرنے نیز اردو، عربی کی تعلیم دینے کی خواہش کو پوری کرے۔

خورشید عالم، بکسر

☆ گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہماری پیاری زبان اردو ان دنوں عجیب کسمپرسی کی شکار ہے۔ غیروں سے تو کیا گلہ، اس کے اپنے بھی اس کے ساتھ سوتیلا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ اردو کے ذریعہ لاکھوں کمانے والے ذی شعور حضرات بھی اپنے نونہالوں کو انگریزی کانوینٹ میں تعلیم دلوانا فخر سمجھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کی زندگی ابتدائی سطح پر اسکولی تعلیم کے معقول انتظام پر منحصر ہے، مگر اس سچائی کو ہمارا بڑا طبقہ فراموش کئے ہوئے ہے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں بہار اردو اکادمی کی مختلف النوع فعالیت واقعی قابل اطمینان ہے۔ ''زبان و ادب'' نئی آب و تاب کے ساتھ پابندی سے مل رہا ہے، جس کے لئے آپ اور آپ کے سبھی معاونین کو پرخلوص مبارک باد۔

محب الرحمٰن وفا، امراوتی

☆ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ماہنامہ ''زبان وادب'' پڑھنا نصیب ہوا۔ محترم! یہ کوئی مبالغہ نہیں کہ ''زبان وادب'' میں سماجی اور ثقافتی مضامین اور عمدہ غزلوں کو جگہ دی گئی ہے۔ یہ رسالہ عرصہ دراز سے اردو کی بیباک خدمت کرتا چلا آرہا ہے۔ دعا ہے کہ اس خدمت میں زیادتی ہو اور رسالہ کی قدر و قیمت، چمک دمک ہمیشہ برقرار ہے۔ آمین

شاہ نواز انصاری، جون پور

☆ بہار اردو اکادمی کے رسالہ ''زبان و ادب'' نے ہندوستان گیر سطح پر قلم کاروں کی پذیرائی کی ہے اور اس کا سلسلہ دراز ہے۔ بہار علم و ادب کا گہوارہ اور اردو کی ترقی کے لئے ہر دور میں پیش پیش رہنے والی ریاستوں میں نمایاں ہے۔ معیاری ادب کے ترجمان ''زبان و ادب'' کی اشاعت کا سلسلہ سدا برقرار رہے، یہی خاکسار کی دعا ہے۔

اسماعیل پرواز، ہوڑہ

☆ ''زبان و ادب'' کے شمارے پابندی سے مل رہے ہیں ادبی دنیا میں شمارہ کا وقت کی پابندی سے برابر ملنا بڑی خوبی ہے جو نایاب نہیں، مگر کمیاب ضرور ہے۔ مضامین کے انتخاب میں ماضی اور حال بڑے پیارے سے گلے ملتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ اداریہ کا انداز بہت خوب ہے۔ سیدھے سادھے لفظوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو جس طرح قلم بند کیا گیا ہے، وہ دماغ پر بوجھ بن کر نہیں ذہن میں تیر بن کر چبھتی ہیں۔

خالد خاں ہادی (علیگ)، رامپور

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔ اگر رجسٹرڈ پوسٹ سے رسالہ منگانا چاہتے ہوں تو اس کے لئے زر سالانہ ۳۵۰ روپے ہوگا۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زر سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے۔ (سرکولیشن انچارج)

PDF Compressor Free Version

بچوں کا
زبان وادب

★	کبوتر: چند دلچسپ حقائق	ڈاکٹر شائستہ انجم نوری	۷۴
★	رازق العباد	صدف جہاں	۷۵
★	جاؤ اور آؤ	ریحانہ خاتون	۷۶
★	علم کی دولت	محمد منظر عالم	۷۷
★	دعا / ہمارے ابو	کاظمہ خاتون عرفیؔ	۷۸
★	نصیحت	حسنؔ امام فدائی	۷۹
★	گڑیا ہے بیمار	فیض احمد	۷۹

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر شائستہ انجم نوری

HOD Urdu, TPS College, Chiraiya Tanr , Patna 800001

کبوتر: چند دلچسپ حقائق

☆ کبوتر آئینہ میں اپنے آپ کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

☆ کبوتروں کو دور دراز کے علاقے سے اپنے گھر جانے کا راستہ یاد رہتا ہے۔

☆ کبوتر مختلف کبوتروں میں فرق سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

☆ کبوتر لمبے عرصے کے لئے مختلف تصاویر ذہن نشیں کر سکتے ہیں۔

☆ کبوتر انسانوں کی نسبت آسانی کے ساتھ ہموار سطح کو 3D میں دیکھ سکتے ہیں۔

☆ کبوتر کے سننے کی صلاحیت انسانوں سے بھی تیز ہے۔ وہ انسانوں کی نسبت کئی درجہ کم فریکوئنسی کی آواز سن سکتے ہیں۔

☆ کبوتر واحد پرندہ ہے جسے پانی نگلنے کے لئے اپنا سر نہیں اٹھانا پڑتا۔

☆ پانچ ہزار سال قبل یونانی قوم نے کبوتروں کا استعمال پیغام رسانی کے لئے شروع کیا۔

☆ کبوتروں کی اڑان کی برداشت ایک دن میں سو کیلومیٹر کی رفتار سے پانچ سو سے سترہ سو کیلومیٹر کی ہے۔

☆ دوسری جنگ عظیم کے دوران پائلیٹ اپنے ساتھ کبوتر لے کر جاتے تھے کہ کہیں انہوں نے اپنا جہاز پھنسا لیا (یعنی تباہ تباہ ہونے سے بچ گیا یا تباہ ہونے کے بعد وہ بچ گیا) تو کبوتر کو مدد کے لئے بطور پیغام رساں استعمال کر سکیں۔ اس طرح بہت سے پائلیٹ نے اپنی زندگیاں بچائیں۔

☆ آج کے دور میں بھی کبوتر جنگی مقاصد کے تحت فرانس، سوئیز، اسرائیل، سوڈان اور چائنیز فوج کے استعمال میں ہے۔

☆ کبوتر اور فاختہ میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔

☆ چھبیس میل کی دوری تک کبوتر آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔

☆ پہاڑوں کی چوٹی پر بیٹھا کبوتر سینکڑوں میل کی دوری سے ہواؤں کا شور تک سن سکتا ہے۔

☆ انیسویں صدی کے آغاز میں ایک کبوتر کی اڑان کو بہت شہرت حاصل ہوئی تھی جسے افریقہ سے چھوڑا گیا اور وہ پچپن دنوں بعد برطانیہ پہنچ گیا۔ اس کبوتر نے پچپن دنوں میں سات ہزار میل تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار کیلومیٹر کا سفر طے کیا۔

☆ ایک عام کبوتر کی چونچ سے دم تک اوسطاً لمبائی تیرہ انچ ہوتی ہے۔

☆ ایک بالغ کبوتر کے قریب دس ہزار پر ہوتے ہیں۔

☆ کبوتروں کی اوسطاً عمر تیس سال ہوتی ہے۔

☆ کبوتر ایک سکنڈ میں دس مرتبہ پر ہلا سکتا ہے اور اس کا دل ایک منٹ میں چھ سو بار دھڑکتا ہے۔

☆ اسلام کے علاوہ ہندوازم، بدھ ازم، سکھ ازم میں بھی کبوتر کو دانہ ڈالنا ثواب سمجھا جاتا ہے۔

(بقیہ ص ۷۶ پر)

PDF Compressor Free Version

صدف جہاں

I-99, Rameshwarpur Road, Matia Burj, Kolkata 700024 (Mob. 9331775376)

رازق العباد

بچو، تمہیں معلوم ہے کہ ہم سبھوں کی تخلیق کرنے والا اللہ رب العزت ہے۔ ساری دنیا پہ اس کی حکمرانی ہے، ساری دنیا کا نظام اسی معبود حقیقی کے اشارے پہ چلتا ہے۔ انسان بالکل بے بس ہے، جو کچھ بھی ظہور پذیر ہوتا ہے وہ اللہ ہی کے حکم سے۔ وہ معبود ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ انسان اور دنیا فانی ہے، لیکن اللہ کی ذات غیر فانی ہے۔ وہ رازق العباد ہے۔ سارے عالم کو رزق دیتا ہے ہم تمام انسان اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اسی سے مدد مانگتے ہیں۔ وہ پاک اور بے عیب ہے۔ ساری دنیا کا محافظ ہے۔ وہ معبود حقیقی ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنا شرک ہے جو بہت بڑا گناہ ہے۔ بار بار اس مالک نے تاکید کی ہے کہ شرک سے پرہیز کرو۔ سب گناہوں کو وہ معاف کردے گا، لیکن شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا، اس لئے ہم لوگوں کو چاہئے کہ صرف اور صرف اسی کی پرستش کریں، جو کچھ بھی مانگنا ہو اسی معبود حقیقی سے طلب کریں۔

اردو کے مشہور شاعر امجد حیدر آبادی نے اپنی رباعی میں کتنے خوبصورت انداز میں یہ بات کہی ہے ۔

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو
منت سے، خوشامد سے، ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

رزق دینے والا وہی معبود ہے جس نے سارے انسانوں کی تخلیق کی ہے۔ ہم محنت اور مزدوری کرتے رہیں، مگر رزق دینے والا وہی مالک ہے۔ اسی سلسلے سے ایک مشہور واقعہ ذیل میں درج ہے۔

ایک مشہور ڈاکو اپنا قصہ یوں بیان کرتا ہے کہ میں اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت لے کر ڈاکہ ڈالنے کی غرض سے جارہا تھا۔ راستہ میں ہم سب ایک جگہ بیٹھے تھے، وہاں ہم نے دیکھا کہ کھجور کے تین درخت ہیں۔ دو پر تو خوب پھل ہیں، مگر ایک بالکل خشک ہے۔ ایک چڑیا بار بار آتی ہے اور پھل دار درختوں سے تر و تازہ کھجور چونچ میں لے کر اس خشک درخت پر جاتی ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ میں نے دس مرتبہ اس چڑیا کو پھل لے جاتے دیکھا۔ مجھے خیال ہوا کہ اس پر چڑھ کر دیکھوں کہ یہ چڑیا کھجور کو کیا کرتی ہے، میں نے اس درخت کی چوٹی پر جا کر دیکھا کہ وہاں ایک اندھا اژدھا منھ کھولے پڑا ہے اور یہ چڑیا وہ تر و تازہ کھجور اس کے منھ میں ڈال رہی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اور میں رونے لگا۔ میں نے کہا کہ میرے مولا سانپ جیسے مارنے کا حکم میرے نبی نے دیا ہے اور تو نے اس اندھے اژدھا کو روزی پہنچانے کے لئے چڑیا مقرر کردیا۔

یہ سارا قصہ میں نے اپنے ساتھیوں کو سنایا تو سب رونے لگے اور کہنے لگے آج سے ہم لوگ عہد کرتے ہیں کہ لوٹ مار ختم کر کے اپنی اپنی روزی کی تلاش میں جٹے رہیں گے۔ وہ معبود حقیقی کتنا بڑا فیاض ہے۔ وہ اندھے اژدھے کو رزق دے سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم جیسے اشرف المخلوقات کو وہ رزق نہیں دے گا، لہٰذا ہم تمام ساتھی اپنی اپنی روزی کی تلاش میں نکل گئے۔

☆ خطرناک دشمن وہ ہے جو دوست بن کر دھوکہ دے
☆ جھوٹ وہ دیمک ہے جو انسان کی سچائی کو کھا جاتی ہے
☆ نرمی سے انسان میں زینت پیدا ہوتی ہے
☆ اللہ کی نظر میں وہ شخص اچھا ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں

PDF Compressor Free Version

ریحانہ خاتون
59, Chuna Shah Colony, O.O.: Mango, Jamshedpur 831012

جاؤ اور آؤ

ایک گاؤں میں ایک امیر کسان رہتا تھا۔ اس کے پاس کافی زمین تھی، جس پر بہت سے آدمی کام کرتے تھے۔ اس کسان کے دو بیٹے تھے۔ جب دونوں بڑے ہوئے تو کسان نے انہیں آدھی آدھی زمین بانٹ دی۔ ساتھ ہی اس نے کام کرنے والے مزدور بھی برابر برابر بانٹ دیے۔ بڑا لڑکا بہت سست اور کاہل تھا۔ وہ کبھی اپنے کھیتوں کو دیکھنے تک نہیں جاتا تھا۔ وہ اپنے مزدوروں سے کہتا: ''جاؤ، کھیت میں جا کر کام کرو۔'' اس کے مزدور من مانی سے کام کرتے تھے۔ نہ وقت پر ہل چلاتے اور نہ ہی بیج بوتے۔ نہ وقت پر کھاد ڈالتے اور سینچائی کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فصلیں کم ہونے لگیں اور دھیرے دھیرے بہت ہی کم ہو گئیں۔ اس طرح کسان کا بڑا بیٹا بہت غریب ہو گیا۔ دوسری طرف کسان کا چھوٹا بیٹا بہت محنتی تھا۔ وہ صبح ہوتے ہی کندھے پر ہل رکھ کر اپنے مزدوروں کو پکارتا: ''آؤ، چل کر کھیتوں پر کام کریں۔'' وہ مزدوروں کو ساتھ لے کر کھیت پر جاتا اور ڈٹ کر کام کرتا۔ اسے دیکھ کر اس کے مزدور بھی خوب محنت کرتے تھے۔ اس کے کھیتوں میں وقت پر ہل چلایا جاتا، وقت پر بیج بوئے جاتے اور سینچائی کی جاتی تھی۔ اس کی فصل دن بہ دن بڑھتی گئی۔ وہ اپنے مزدوروں کو زیادہ کام کرنے پر انعام بھی دیتا تھا۔ کچھ ہی برسوں میں چھوٹا بیٹا کافی امیر ہو گیا۔

ہوشیار کسان دونوں بیٹوں میں فرق سمجھتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلایا اور پہلے بڑے بیٹے سے پوچھا:

''بیٹے، کیسے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں بالکل غریب ہو گیا ہوں، میری قسمت ہی خراب ہے۔'' پھر اس نے اپنے چھوٹے بیٹے سے حال چال پوچھا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا: ''آپ کی دعاؤں سے دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے... اللہ بڑا کرم کر رہا ہے۔''

بوڑھے کسان نے کہا: ''دیکھو، تم دونوں کو میں نے برابر برابر زمین کا حصہ دیا۔ وہ حصہ ہی تمہاری قسمت تھی۔ تمہاری قسمت میں کوئی فرق نہیں، فرق صرف جاؤ اور آؤ میں ہے۔'' بڑے بیٹے نے حیرت سے پوچھا: ''یہ 'جاؤ اور آؤ' کا کیا مطلب ہے؟'' باپ نے سمجھایا:

''تم ہمیشہ اپنے مزدوروں سے کہتے ہو، جاؤ کام کرو جب کہ تمہارا چھوٹا بھائی اپنے مزدوروں سے کہتا ہے، 'آؤ کام کریں۔''

باپ کی بات سن کر بڑے بیٹے کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس دن سے وہ بھی محنت کرنے لگا اور اس کے کھیتوں کی فصل بھی بڑھنے لگی۔

کبوتر: چند دلچسپ حقائق (صفحہ ۷۴ سے آگے)

☆ جب کھانا کھانے کی باری آئے اور اگر وہاں بہت سا کبوتر ہو تو نر یا مادہ کبوتر وہاں موجود کسی بھی کبوتر کے بچے کو کھانا کھلا دیتا ہے چاہے وہ اس کا اپنا بچہ ہو یا نہ ہو۔

☆ کہا جاتا ہے کہ جس شخص نے اپنی زندگی میں کبوتر کے گوشت کھایا ہو اس کے دماغ میں لقوا نہیں ہو سکتا، اگر ہوگا بھی تو وہ شخص برین ہیمرج سے بچا رہے گا۔

☆ آج تک کا سب سے مہنگا کبوتر دو لاکھ پچیس ہزار میں فروخت ہوا۔

☆ پوری دنیا میں لاکھوں ڈالر کے جوڑے کے ساتھ کبوتروں کی پانچ بڑی ریس ہوئی ہے۔

☆ جنگ عظیم اول کے دوران ''چرامیں'' (ایک پیارا دوست) نامی کبوتر نے دشمن کے حدود پار کرتے ہوئے ایک پیغام پہنچا کر کئی فرانسیسی فوجوں کی جان بچائی۔ اس کبوتر کو سینے میں، ٹانگ میں گولی لگی۔ اسی ٹانگ میں گولی لگی تھی جس میں پیغام بندھا تھا۔ اس کی ٹانگ سے بہت سا گوشت اتر گیا تھا، لیکن پھر بھی زہریلی گیسوں سے بچتے ہوئے پچیس منٹ تک اس نے پرواز جاری رکھی اور پیغام پہنچا دیا۔ اس کبوتر کو امتیازی انعام سے نوازا گیا تھا۔

PDF Compressor Free Version

محمد منظر عالم

Secretary,National Urdu Library, Reorha , Darbhanga

علم کی دولت

بچو! آؤ، تمہیں ایک قصہ سناؤں۔ یہ قصہ مزے دار بھی ہے اور اس میں بڑا سبق بھی ہے۔ یہ بیگوسرائے کے مشہور گاؤں بیگم پور کا ایک سچا قصہ ہے۔ وہاں ایک کنبہ میں دو بھائی، خاندانی زمین وجائیداد کی تقسیم کے بعد اپنی زندگی من کے مطابق گزار رہے تھے۔

بڑے بھائی جن کا نام محمد شمیم تھا ان کے پاس تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ انہوں نے اپنی کسی بھی اولاد کو ٹھیک سے تعلیم نہیں دی اور کم عمری میں ہی بیٹوں کو پردیس بھیج کر ان کے ذریعہ آنے والی رقم سے اپنی زندگی آرام کے ساتھ گزارتے رہے۔

شمیم کے چھوٹے بھائی کا نام محمد نسیم تھا اور ان کا ایک ہی لڑکا تھا شارق۔ وہ پڑھنے میں نہایت ذہین اور محنتی تھا۔ محمد نسیم اگرچہ ایک معمولی کسان تھے، مگر خود محنت ومزدوری کر کے انہوں نے اسے پڑھانے کے لئے ہر طرح کی کوشش کی اور مشکلات سے دوچار ہوتے ہوئے بھی کبھی ہمت نہیں ہاری۔ جب شارق کی پڑھائی کے اخراجات ان کی قلیل آمدنی سے پورے نہیں ہونے لگتے تو اپنی زمین کو فروخت کرنے کی کوشش کرتے، مگر محمد شمیم انہیں روکتے اور خریدار کو بھی ڈراتے کہ زمین مت لو۔ میں قبضہ نہیں ہونے دوں گا کیوں کہ اس پر میرا بھی پیسہ باقی ہے۔ وہ محمد نسیم کو ڈانٹ پھٹکار لگاتے کہ کیا زمین بیچ کر ہمارے خاندان کی عزت و آبرو کی نیلامی کروگے۔ شارق کو پردیس کمانے کے لئے بھیج دو اور میری طرح آرام سے زندگی گزارو، مگر محمد نسیم یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ مجھے آپ جیسی زندگی گزارنے کا شوق نہیں اور نہ ایسی آرام کی زندگی مجھے پسند ہے۔

بچوں کے مستقبل کو تاریکی کی عمیق گہرائیوں میں ڈال کر خود وقتی آرام وسکون کی زندگی گزاروں یہ مجھے گوارا نہیں، کیا ہوا؟ جو زمین نہیں رہے گی پر اپنے بیٹے کا روشن وتابناک مستقبل بنا کر ہی میں دم لوں گا، تاکہ ایک دن سبھوں کو احساس ہو کہ علم کی دولت سب سے بڑی دولت ہے اور اس کے مرتبہ سے کوئی مرتبہ بڑا نہیں ہے۔

محمد نسیم کے بیٹے نے بھی باپ کا خواب پورا کیا خوب محنت سے پڑھتے ہوئے اس نے ہر امتحان میں اچھی کامیابی حاصل کی اور آخر ایک دن افسر بن کر یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ محنت کبھی رائگاں نہیں جاتی۔

ادھر محمد شمیم کے لڑکے کی شادی ہوئی تو وہ پردیس کی کمائی چھوڑ کر گھر پر ہی رہنے لگا، آمدنی ختم ہو جانے اور اخراجات کے بوجھ میں دبے ہونے کے باعث محمد شمیم کے خاندان کا نقشہ ہی بدلنے لگا۔ زمین گروی رکھ دی گئی اور سب پریشانی میں زندگی گزارنے لگے۔ اتفاق کی بات کہ کچھ دنوں بعد شارق کا تبادلہ اپنے ہی علاقہ میں ہو گیا اور اسے ہر وقت اس بات کی فکر اور غم ستاتا رہا کہ میرے چچا اور بھائی جو جہالت کے دل دل میں پھنس کر غریبی اور احساس کمتری میں زندگی سسک سسک کر گزار رہے ہیں، آخر میں کس طرح ان لوگوں کو اس غریبی وجاہلیت سے نکال کر تعلیم یافتہ اور خوشحال بناؤں، اب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا تو ان کے لئے ممکن نہیں، لیکن غریبی سے انہیں نکالا جا سکتا ہے۔ شارق نے سب سے پہلے ان لوگوں کی ساری گروی زمین کو واپس کرا دیا اور پھر دھیرے دھیرے تینوں بھائیوں کو چند طرح کے ٹھیکے دلا دیے اور اس طرح اپنے گاؤں کی ترقی کے راستے کھول دئے اور بھائیوں کا مستقبل بھی سنوار دیا۔ شارق کی اس کارکردگی سے سارے لوگ خوش ہو گئے اور اس بات کا اعتراف کیا کہ واقعی علم کی بدولت انسان میں اعلیٰ فکر اور زندگی کا سلیقہ آتا ہے۔

اس لئے بچو! تم بھی محنت ولگن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرو، اعلیٰ افسر بنو اور اپنے والدین کے ساتھ گاؤں، کنبہ اور شہر کا نام روشن کرو اور ہمیشہ دوسروں کی بھلائی کرتے رہو۔

PDF Compressor Free Version

کاظمہ خاتون عرفی
Mohalla Shah Toli, Danapur Cantt. Patna 801503

دعا

الٰہی مجھے دین و حدت عطا کر
مجھے شرک و بدعت سے نفرت عطا کر
میں ہر اک قدم پر ڈروں تجھ سے یارب
مرے دل کو خوف و خشیت عطا کر
تری یاد سے رشک جلوت بنا دوں
مجھے اپنے گھر میں وہ خلوت عطا کر
دلوں میں مقام اپنا پیدا میں کر لوں
الٰہی مجھے حسن سیرت عطا کر
کروں اپنے ہاتھوں سے سب کام گھر کے
مجھے فاطمہؓ کی طبیعت عطا کر
بڑی غفلتیں ہیں ، تن آسانیاں ہیں
مجھے رابعہؒ کی ریاضت عطا کر
رہیں خوش مرے گھر کے افراد مجھ سے
الٰہی مجھے ذوق خدمت عطا کر
یہ عرفی تری بس یہی چاہتی ہے
اسے دین و دنیا میں عزت عطا کر

❁❁❁

ہمارے ابو

اک وسیع سایبان ہوں جیسے
سر پہ وہ آسمان ہوں جیسے

قاعدہ ہے عجب مروّت کا
اک سمندر لگے محبت کا

جینے کے حوصلے دلاتے ہیں
اپنی دنیا حسیں بناتے ہیں

ہم پہ وہ جاں نثار کرتے ہیں
زندگی خوشگوار کرتے ہیں

ان سے مہکی حیات ہے اپنی
اصل یہ کائنات ہے اپنی

جذبہ چاہت کا خوب بہتا ہے
سر پہ جب ان کا سایہ رہتا ہے

زندگی میں حسین راحت ہے
باپ بھی کیا عظیم نعمت ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

حسنؔ امام فدائی

Sweet Rose School, Dr. Zakir Hussain Road
Hazaribagh, Jharkhand (Mob. 9031815471)

نصیحت

باطل کے آگے سر کو جھکانا نہ تم کبھی
ماں باپ کے دلوں کو دکھانا نہ تم کبھی

اللہ نے بخشی ہے جو طاقت تمہیں میاں
کمزور کو قوت یہ دکھانا نہ تم کبھی

آواز دے رہا ہے تمہیں دور پر فتن
کہ دشمنوں کو دل میں بٹھانا نہ تم کبھی

کہنا نہ تم عدو سے کبھی اپنا رازِ دل
کم ظرف کو ہر بات بتانا نہ تم کبھی

ہے مشورہ حسنؔ کا زمانے کو دوستو
یعنی غریب دل کو دکھانا نہ تم کبھی

فیض احمد

Azizi Manzil, Khanmirza, Sultanganj, Patna

گڑیا ہے بیمار

سن لو ڈاکٹر مری پکار
میری گڑیا ہے بیمار

کل جو برسا جھم جھم پانی
بھیگ گئی تھی گڑیا رانی

گیلے کپڑے دئے اتار
پھر بھی اس کو تیز بخار

کیسے اترے اس کا بخار
میری کوشش ہوئی بے کار

میٹھی دوائیں شوق سے کھاتی
کرتی سوئی سے انکار

جب تک رہے گی گڑیا بیمار
ڈاکٹر تیری فیس ادھار

PDF Compressor Free Version

تقسیم ایوارڈ کے خوبصورت مناظر

وزیر اقلیتی فلاح ڈاکٹر عبدالغفور کو مومنٹو سے استقبال کرتے ہوئے اکادمی سکریٹری مشتاق احمد نوری

ڈاکٹر شگفتہ یاسمین وزیر موصوف سے مومنٹو لیتے ہوئے

عبدالمنان طرزی وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

قوس صدیقی وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

نورالہدیٰ وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

پروین کمار اشک وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

شموئل احمد وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

طارق جمیلی وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

دبیر الحسن عاقل وزیر محترم اور وی سی مگدھ یونیورسٹی سے ایوارڈ لیتے ہوئے

ناشاد اورنگ آبادی وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

رضی حیدر وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

ایم کمار بے باک وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

احمد جاوید وزیر محترم اور وی سی مگدھ یونیورسٹی سے ایوارڈ لیتے ہوئے

اشرف استھانوی وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

ڈاکٹر اسرار احمد وزیر محترم اور پروفیسر محمد اشتیاق سے ایوارڈ لیتے ہوئے

معین کوثر وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

خورشید پرویز صدیقی وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے

ڈاکٹر عابد انور وزیر محترم سے ایوارڈ لیتے ہوئے